محبت کا عہد نامہ

صابر ظفر



دریچہ بے صدا کوئی نہیں ہے
اگرچہ بولتا کوئی نہیں ہے

میں ایسے جمگھٹے میں کھو گیا ہوں
جہاں میرے سوا کوئی نہیں ہے

رکوں تو منزلیں ہی منزلیں ہیں
چلوں تو راستا کوئی نہیں ہے

کھلی ہیں کھڑکیاں ہر گھر کی لیکن
گلی میں جھانکتا کوئی نہیں ہے

کسی سے آشنا ایسا ہوا ہوں
مجھے پہچانتا کوئی نہیں ہے

محبت کا عہد نامہ

صابر ظفر

کتاب سے بہتر کوئی دوست نہیں

اشاعت اول : مارچ 2009ء

سرورق : جمیل نقش

انتخاب : طاہر نظامی، ریاض تسنیم

قیمت : 300روپے

صابر ظفر

Cell: 0300-2101223

ناشر : آرٹس کونسل آف پاکستان، کراچی

اہتمام اشاعت: دُنیائے ادب، کراچی (نگراں: اوج کمال)

623،6th فلور، ریگل ٹریڈ اسکوائر، ریگل چوک، صدر کراچی۔74400، پاکستان

Ph:0092-21-2744987/021-8480816 Cell:0300-2797271

E-mail: aujekamal@yahoo.com

غالب احمد کے نام

صابر ظفر کے مطبوعہ شعری مجموعے

- ابتدا (غزلیں)
- دُھواں اور پھول (غزلیں)
- پاتال (غزلیں)
- جتنی آنکھیں اچھی ہوں گی (گیت)
- دریچہ بے صدا کوئی نہیں ہے (غزلیں)
- لہو ترنگ (گیت اور غزلیں)
- دُکھوں کی چادر (گیت اور غزلیں)
- بارہ دری میں شام (غزلیں)
- عشق میں روگ ہزار (غزلیں)
- اک تری یاد رہ گئی باقی (غزلیں)
- بے آہٹ چلی آتی ہے موت (غزلیں)
- چین اک پل نہیں (گیت اور غزلیں)
- اپنے رنگوں میں ڈوب جانے دے (غزلیں)
- محبت کا نیل کنٹھ (غزلیں)
- کوئی لو چراغ قدیم کی (غزلیں)
- نامعلوم (غزلیں)
- پرندوں کی طرح شامیں (غزلیں)
- محبت دور کی آواز تھی (غزلیں)
- سانول موڑ مہاراں (غزلیں)
- زنداں میں زندگی امر ہے (غزلیں)
- خاموش بدن کی خودکلامی (غزلیں)
- ہر چیز کلام کر رہی ہے (غزلیں)
- ستارہ وار تخن (غزلیں)

مطبوعہ شعری انتخاب

- صابر ظفر کی مزاحمتی شاعری
- آزان
- پل دو پل کی چاہت میں
- ترے عشق نے مالا مال کیا
- محبت ہو نہیں پائی
- محبت کا عہد نامہ

حرفِ اوّل

رساچغتائی، خالد علیگ اور انور شعور کی کتب کی اشاعت کے بعد آرٹس کونسل آف پاکستان، کراچی ایک بار پھر ایک اور صاحبِ طرز شاعر صابر ظفر کی شاعری کا انتخاب شائع کر رہا ہے۔

صابر ظفر کی شاعری اور اُن کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ جدید غزل گوئی میں اہم مقام رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک ایسے شاعر ہیں جنہیں قبولیتِ عام کی سند حاصل ہے۔ جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ صابر ظفر گزشتہ چالیس برس سے میدانِ شعر گوئی میں جھنڈے گاڑ رہے ہیں۔ پہلے مجموعۂ کلام 'ابتدا' سے لے کر 'ستارہ وارسخن' تک اُن کی توانائی ہنوز برقرار ہے۔

صابر ظفر ہمہ جہت شاعر ہیں۔ آج پاکستان اور بیرونِ پاکستان، نئی نسل اُن کا کلام دُہراتی نظر آتی ہے۔ آپ کو اس انتخاب میں وہ سب غزلیں نظر آئیں گی جو زبان زدِ خاص وعام ہیں۔

صابر ظفر کے ۲۳ شعری مجموعوں کے بعد یہ احساس مطالبہ کر رہا تھا کہ اُن کا ایک شعری انتخاب بھی سامنے آجانا چاہیے چنانچہ آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی جو مسلسل علم وادب کی ترویج میں مصروف ہے، نے صابر ظفر کا انتخاب شائع کرنے میں فخر محسوس کیا اور اس ارادے کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر آپ کے روبرو پیش کرنے کا اعزاز حاصل کر رہا ہے۔

ہمارا سفر یہیں نہیں رُکا ہے بلکہ بہت جلد سراج الدین ظفر، عزیز حامد مدنی، قمر جمیل، نگار صہبائی اور دیگر شعرأ کے مجموعہ ہائے کلام بھی آرٹس کونسل کے زیرِ اہتمام شائع کیے جائیں گے۔

اُمید ہے کہ میری طرح آپ کو بھی صابر ظفر کی شاعری کا انتخاب 'محبت کا عہد نامہ' پسند آئے گا۔

محمد احمد شاہ

(سیکریٹری، آرٹس کونسل آف پاکستان، کراچی)

فہرست

۱۰۱۔ بدن نہاتا ہوا چاندنی میں دیکھا گیا

۱۰۲۔ بے سروساماں رواں ہے کارواں اور ایک مَیں

۱۰۳۔ وہ دور تھا قریب آگیا تو چین آگیا

۱۰۴۔ گرفتِ بحر سے باہر نکل نہ جاؤں کہیں

۱۰۵۔ یہ زمیں بھی خواب ہے یہ آسماں بھی خواب ہے

۱۰۶۔ وہ آج ہے مہرباں نہ کل تھا

۱۰۷۔ سائل ہیں وہ جو دوسرے سائل کے ساتھ ہیں

۱۰۸۔ دل میں پیدا ہوئی طلب کوئی

۱۰۹۔ دن کوئی دن ہو اور نہ کوئی رات، رات ہو

۱۱۰۔ کالے تیتر نے بول بول کے رات

۱۱۱۔ دکھ دے کے مہرباں کو ستم گر سے جا ملا

۱۱۲۔ اگر بے زبانی کو آواز کرتا

۱۱۳۔ بدن کی روشنی باہر قبا سے دیکھی گئی

۱۱۴۔ میں انتظار کروں گا اگر ترا سایہ

۱۱۵۔ قسمت میں اگر جدائیاں ہیں

۱۱۶۔ آنکھ کی سوکھتی سی جھیلوں میں، اپنے دیدار کا کنول رکھ دے

۱۱۷۔ اک تری یاد رہ گئی باقی

۱۱۸۔ نوکِ پاپوش پہ رکھتا ہوں مَیں تجھ کو ترے دربار سمیت

۱۱۹۔ رگوں میں جو رات ڈھل رہی تھی

۱۲۰۔ مری یاد میں ہے اجل نہاں، مجھے بھولنے کی دعا کرو

۱۸۱۔ تال کا پانی ٹھہرا ٹھہرا، گم صم سبھی مولے
۱۸۲۔ یہ اور بات ترے روبرو نہیں گزرا
۱۸۳۔ یہ بھی کیا زندگی ہماری ہے
۱۸۴۔ میں سوچتا ہوں جسے، آشنا بھی ہوتا ہے
۱۸۵۔ آب میں ہم رہے تو یُوں، آب پرست ہو گئے
۱۸۶۔ کھڑکیاں جو کھلی رہیں شب بھر
۱۸۷۔ وہی ستارہ دوبارہ ادھر سے گزرا تھا
۱۸۸۔ ملتا رہا پانیوں میں پانی
۱۸۹۔ خاک میں کیا ہے، نہ ہو تُو جو وہاں آسودہ
۱۹۰۔ غزال اک نئی وحشت سے اس طرف آیا
۱۹۱۔ چلو تو ساتھ چلو ورنہ ہم گئے تو گئے
۱۹۲۔ چھوڑ کے میرا بحرِ دل، جانبِ آبِ زر گئے
۱۹۳۔ یہ تو وہ صورت نہیں، یہ تو وہ سیرت نہیں
۱۹۴۔ وجود کیا ہے عدم کیا ہے کچھ نہ تھا معلوم
۱۹۵۔ بکھری ہوئی کوئی کتاب، ڈھونڈ رہی تھی جلد ساز
۱۹۶۔ وہ جس میں ناچ سکے زندگی کی رقاصہ
۱۹۷۔ ستارے رات جو چادری اک بچھاتے ہیں
۱۹۸۔ پختگیِ خیال اب، صورتِ خواب ہو گئی
۱۹۹۔ دکھا کے اپنے حسن کی ادا، عجب عجب طرح
۲۰۰۔ ہمیشہ حلقۂ نامہرباں میں رہتے ہیں

۲۲۱۔ مجھے عشق، مست توکلی، ترے عشق سا نہیں چاہیے
۲۲۲۔ میں بھی ہوں اک مکان کی حد میں
۲۲۳۔ میں ٹوٹ پھوٹ گیا ہوں اب اپنے اندر پھر
۲۲۴۔ دھوپ میں بادل روکتا ہے یا پیڑ کوئی ٹھہراتا ہے
۲۲۵۔ شجر وہ چھوڑ آیا، آشیانہ چھوڑ آیا مَیں
۲۲۶۔ جو بات دل میں ہے، لب پر اسے نہ لاؤں کیوں
۲۲۷۔ مہرباں جب ترا خیال ہوا
۲۲۸۔ سرِ دست تو تہی دست ہی تری سمت ہم چلے آئے ہیں
۲۲۹۔ یہ جو تری خوش بیانیاں ہیں
۲۳۰۔ ادھر ادھر سے چنوں کوئی حرف اور نہ خیال
۲۳۱۔ یہاں جو پیڑ تھے اپنی جڑوں کو چھوڑ چکے
۲۳۲۔ تمہارے ہوتے ہوئے بھی ہوں مَیں خسارے میں
۲۳۳۔ گم ہے شہزادئ شب اور پری ہے خاموش
۲۳۴۔ ہوا میں خاک سہی، خاک میں ہوا تو نہیں
۲۳۵۔ ہزار مرتبہ اس نام سے پکارا اسے
۲۳۶۔ یہ زیست یوں تو شب و روز کی غلام نہ ہو
۲۳۷۔ بھگونا چاہتی تھیں بارشیں، سو ہم بھیگے
۲۳۸۔ غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی مانند
۲۳۹۔ ہو گیا بے آرزو مَیں، آرزو کرتا ہوا
۲۴۰۔ اگر کٹ گئی آج زنداں میں رات

۲۶۱۔ پاتال میں تم ہمیں رہنے دو صاحب، آکاش کنارے نہیں چاہئیں ہم کو

۲۶۲۔ تُو بھی کہیں مبتلا تو ہوگا

۲۶۳۔ آئے ہو سوئے شہر تو بازار دیکھنا

۲۶۴۔ فروغِ مے سے فروزاں تھا میکدہ سرِ شام

۲۶۵۔ کوئی ہے اگر تو دکھائی دے

۲۶۶۔ تقسیم ہو چکی ہے جو خانوں میں زندگی

۲۶۷۔ خود اپنے واسطے جاں کا وبال ہو جاؤں

۲۶۸۔ میں جس کے ساتھ ظفرؔ عمر بھر اٹھا بیٹھا

۲۶۹۔ مل نہیں رہا ہے تُو

۲۷۰۔ بھٹک رہے ہیں کہ تشکیک دل سے جاتی نہیں

۲۷۱۔ ہوا کے تار میں کچھ سسکیاں پرونے میں

۲۷۲۔ بادباں کھول دو پانی میں اتر جانے دو

۲۷۳۔ لب ہیں تو گلاب کس لیے ہیں

۲۷۴۔ ادھر بھی کچھ نہیں، جا کے ادھر ہوا معلوم

۲۷۵۔ ممکن ہے جتنا، اس سے زیادہ بکھیر دے

۲۷۶۔ ساتھ تیرے، ترا ہمزاد نہیں رہ سکتا

۲۷۷۔ پڑا نہ فرق انوکھی زبان لکھنے سے

۲۷۸۔ ہر طرف زندگی کی خوشبو ہے

۲۷۹۔ ہو نہ سکا آج تک، ہم سے تو قائل وہی

۲۸۰۔ اب خود سے مجھے قریب تر کر

۳۰۱۔ نہ مَیں خاک پر، نہ مَیں چاک پر، مرے کوزہ گر
۳۰۲۔ ملالِ رفتہ کو آئندہ سے ملا رکھنا
۳۰۳۔ خوشبو تو سیرِ دشت کو جائے ہوا کے ساتھ
۳۰۴۔ پیرہن ہی کی نہیں کوئی خبر تو کیا ہے
۳۰۵۔ آگے چلتا ہے کبیرا اور مَیں پیچھے اس کے
۳۰۶۔ کیا خبر تھی تُو گھر نہ آئے گا
۳۰۷۔ سوال کو نہ کریں حل، دعا کیے جائیں
۳۰۸۔ یاد پھر دل کو چھو گئی کوئی
۳۰۹۔ میں کیسے دل کو سنبھالوں کہ دلربا گم ہے
۳۱۰۔ بجائے زندگی اب موت ہے کہانی میں
۳۱۱۔ پرندوں سے کہو پنجروں کے در کھل کے رہیں گے
۳۱۲۔ میں گریز کیا کرتا، اس کے ساتھ چلنے سے
۳۱۳۔ جہاں سے تنگ ہے جاں سے گزرنا چاہتا ہے
۳۱۴۔ کوئی تو ترکِ مراسم پہ واسطہ رہ جائے
۳۱۵۔ کھدائی کو کھنڈر کوئی نہیں ہے
۳۱۶۔ ہر ایک مرحلۂ درد سے گزر بھی گیا
۳۱۷۔ اب کہیں اور کہاں خاک بسر ہوں ترے بندے جا کر
۳۱۸۔ کیا خبر لوٹ کر پھر کبھی مَیں نہ آؤں یہاں الوداع
۳۱۹۔ بت بنے بیٹھنا، پہلو بھی بدلتے رہنا
۳۲۰۔ خزاں کی رت ہے جنم دن ہے اور دھواں اور پھول

O

دریچہ بے صدا کوئی نہیں ہے
اگرچہ بولتا کوئی نہیں ہے

میں ایسے جمگھٹے میں کھو گیا ہوں
جہاں میرے سوا کوئی نہیں ہے

رکوں تو منزلیں ہی منزلیں ہیں
چلوں تو راستا کوئی نہیں ہے

کھلی ہیں کھڑکیاں ہر گھر کی لیکن
گلی میں جھانکتا کوئی نہیں ہے

کسی سے آشنا ایسا ہوا ہوں
مجھے پہچانتا کوئی نہیں ہے

O

تم اپنے گرد حصاروں کا سلسلہ رکھنا
مگر ہمارے لیے کوئی راستہ رکھنا

ہزار سانحے پردیس میں گزرتے ہیں
جو ہو سکے تو ذرا ہم سے رابطہ رکھنا

خزاں رکھے گی درختوں کو بے ثمر کب تک
گزر ہی جائے گی یہ رت بھی حوصلہ رکھنا

تمہارے ساتھ سدا رہ سکیں ضروری نہیں
اکیلے پن میں کوئی دوست دوسرا رکھنا

زیادہ دیر ظفرؔ ظلم رہ نہیں سکتا
اگر اب آئیں کڑے دن تو جی کڑا رکھنا

○

صورتِ مرگ فقط راہ کی ٹھوکر نکلی
زندگی تُو مرے اندازے سے کم تر نکلی

دھوپ نے دکھ دیا لیکن مجھے تنہا نہ کیا
ایک پرچھائیں مرے جسم سے باہر نکلی

تیرے چہرے سے کھلا مجھ سے بچھڑنے کا ملال
شکل اک اور تری شکل کے اندر نکلی

صرف چکّر ہی نہیں پاؤں میں زنجیر بھی ہے
میری حالت مری قسمت سے بھی ابتر نکلی

آتشِ کبر نکلتی ہی نہ تھی دل سے ظفرؔ
چوبِ منبر کو جلایا تو یہ کافر نکلی

○

دن کو مسمار ہوئے، رات کو تعمیر ہوئے
خواب ہی خواب فقط روح کی جاگیر ہوئے

عمر بھر لکھتے رہے پھر بھی ورق سادہ رہا
جانے کیا لفظ تھے جو ہم سے نہ تحریر ہوئے

یہ الگ دکھ ہے کہ ہیں تیرے دکھوں سے آزاد
یہ الگ قید ہے ہم کیوں نہیں زنجیر ہوئے

دیدہ و دل میں ترے عکس کی تشکیل سے ہم
دھول سے پھول ہوئے، رنگ سے تصویر ہوئے

کچھ نہیں یاد کہ شب رقص کی محفل میں ظفؔر
ہم جدا کس سے ہوئے، کس سے بغل گیر ہوئے

O

کلام کرتا ہوا راستا بناتا ہوا
گزر رہا ہوں مَیں اپنی فضا بناتا ہوا

مجھے نہ ڈھانپ سکی عمر بھر کی بخیہ گری
برہنہ رہ گیا مَیں تو قبا بناتا ہوا

یہی بہار ہے میری کہ مَیں گزرتا ہوں
ہر ایک خشک شجر کو ہرا بناتا ہوا

کسی بھی شاخ نے دیکھا نہیں پلٹ کے اسے
پرندہ سوکھ گیا گھونسلا بناتا ہوا

اب اور کیا ہو ظفؔر انتہا مشقّت کی
شکستہ ہو گیا مَیں آئنہ بناتا ہوا

O

خدا کا ذکر نہ کر اِن اداس لوگوں سے
یہ اہلِ دہر ہیں، رکھتے ہیں آس لوگوں سے

زمیں سفر میں ہے، اپنی جگہ ہے کون یہاں
سہارا مانگنا کیا، بے اساس لوگوں سے

ستارے ٹوٹتے رہتے ہیں بجھتے رہتے ہیں
تو کیا امید، ستارہ شناس لوگوں سے

یہ تیرے ہاتھ بہت نرم بھی ہیں گرم بھی ہیں
انہیں ملایا نہ کر، بدحواس لوگوں سے

پرانے لوگ ہیں ہم، عیب ڈھانپنے والے
چرا رہے ہیں نظر، بے لباس لوگوں سے

O

یہ پہلی پہلی لگن کا معاملہ ہے عجیب
کہ بیل اس سے لپٹتی ہے جو شجر ہو قریب

یہ دل بھی طاق پہ رکھ دو بجھے دیے کی طرح
کسی بھی چیز کی گھر میں اگر نہیں ترتیب

مجال ہے کبھی حرمت پہ حرف آیا ہو
نجانے سیکھی تھی عشاق نے کہاں تہذیب

تم اپنی آنکھوں میں اک پل مجھے اترنے تو دو
میں ڈوب جاؤں کہ لگ جاؤں پار، میرا نصیب

ظفرؔ جو لوگ تھے شفاف آئنوں کی طرح
انہی کے بارے میں باتیں ہوئیں عجیب و غریب

O

بکھرتا پھول جیسے شاخ پر اچھا نہیں لگتا
محبت میں کوئی بھی عمر بھر اچھا نہیں لگتا

میں اس کو سوچتا کیوں ہوں اگر ندرت نہیں اس میں
میں اس کو دیکھتا کیوں ہوں اگر اچھا نہیں لگتا

بکھرنے اور بھٹکنے کے لیے تنہائی کافی ہے
کوئی منزل نہ ہو تو ہم سفر اچھا نہیں لگتا

کسی صورت تعلق کی مسافت طے تو کرنی ہے
مجھے معلوم ہے تجھ کو سفر اچھا نہیں لگتا

ہزار آوارگی ہو بے ٹھکانہ زندگی کیا ہے
وہ انساں ہی نہیں ہے جس کو گھر اچھا نہیں لگتا

O

ہماری جان ہے جانی تو جائے
مگر یہ دل کی ویرانی تو جائے

نہیں ممکن اگرچہ پیاس بجھنا
مگر پیاسوں تلک پانی تو جائے

لباسِ خاک ہی پہناؤ ہم کو
کسی صورت یہ عریانی تو جائے

بہت ذرّاتِ زر شامل ہیں اس میں
یہ خاکِ عاشقاں چھانی تو جائے

لگا لو پھر گلے صابر ظفؔر کو
تمہاری کچھ پشیمانی تو جائے

O

خموش ہو گیا یوں کوئی بات کرتے ہوئے
ہوا سے کُچھ نہ کہے جیسے گل بکھرتے ہوئے

میں زینہ زینہ جسے لے گیا بلندی پر
وہ میرے ساتھ نہ تھا سیڑھیاں اترتے ہوئے

اکیلے پن کا سبب اور ہے کوئی، لیکن
ترا خیال بھی آتا ہے آہ بھرتے ہوئے

وہ حسن تھا کہ حیا تھی کہ پہلی بار اس نے
چھپا لیا تھا بدن، آئنے سے ڈرتے ہوئے

ہمارا عہدِ جوانی ہو یا تمہارا شباب
یہ شہ سوار تو لگتے نہیں ٹھہرتے ہوئے

○

درخت کاٹ کے سایہ فروخت کرتے ہیں
اور اس کے بعد کڑی دھوپ سے گزرتے ہیں

وہ خود ہی ڈھاتے ہیں اپنے گھروں کی بنیادیں
اور اس کے بعد کہیں اور جا ٹھہرتے ہیں

ہمیں خود اپنے مسائل پہ غور کرنا ہے
کہ روز روز صحیفے نہیں اترتے ہیں

ستم سہے ہیں بہت ہم نے تیرے لوگوں کے
سو دیکھتے ہیں تجھے اور آہ بھرتے ہیں

ظفر جو لوگ ہوں اونچی اڑان سے خائف
وہی ہمیشہ پرندوں کے پَر کترتے ہیں

○

اس کا جدا تھا رنگ، جدا اپنا رنگ تھا
ویسے بھی وہ لباس مرے تن پہ تنگ تھا

جل بھی رہا تھا مَیں وہاں، بجھ بھی رہا تھا مَیں
محفل میں شمع تھی نہ ہی کوئی پتنگ تھا

شاید لکھی تھی سنگ زنی ہی نصیب میں
دیوانہ ورنہ کب کوئی مشتاقِ سنگ تھا

مدہوش مَیں تھا، پھر بھی نہ بھولا وہ صبح تک
اس گل بدن کا رات کو جو رنگ ڈھنگ تھا

سانسوں میں اس کی سانسوں کا ایسے رہا گماں
جیسے وہ میرے گرم لہو کی ترنگ تھا

○

وہ مجھے چھوڑ گیا دکھ بھری حیرانی میں
خاک پر قتل ہوا اور ملا پانی میں

عکس پہلے تھا جہاں، اب ہے وہاں بہتا لہو
کیا چھپائے گا کوئی آئنہ عریانی میں

ایک حالت بھی نہیں ایسی کہ جو غیر نہ ہو
چین مشکل میں ہے اب اور نہ آسانی میں

کیا کہیں، کیا ہوئے اسبابِ نشاطِ شب و روز
زندگی بیت گئی بے سر و سامانی میں

زندہ رہنے کی ظفرؔ آئے نظر شکل کوئی
اصل کی ایک جھلک بھی ہو اگر ثانی میں

○

کئی دنوں سے دیا ہی جلا نہ تھا گھر میں
پڑا تھا فرش پہ مَیں اور اجل برابر میں

سسک رہی تھی مرے پاس کوئی سرگوشی
کسی سراب کی وحشت تھی اس کے پیکر میں

ہر ایک راستا جاتا تھا سیڑھیوں کی طرف
اتر رہی تھیں سبھی سیڑھیاں سمندر میں

میں جی رہا تھا تو اس نے کہا تھا 'مر مرے ساتھ'
پھر اس کے بعد لہو گھل گیا تھا منظر میں

وہ پل کہ جو مجھے سرگرم کرنے والا تھا
گزر گیا تو ظفرؔ جل بجھا مَیں پل بھر میں

○

دوبارہ ہونے لگے منظروں میں منظر گم
کہاں ہے تُو کہ ہے موجود گم، میّسر گم

میں تیرے دھیان کے دامن کو تھام کر نکلا
وگرنہ دیکھا گیا خضر گم، سکندر گم

میں اس کو ڈھونڈنے نکلا ہوں طاق راتوں میں
انہی شبوں میں کہیں ہے شبِ منور گم

جب اس کا ذکر کرو گے تو کھوئے جاؤ گے
کہ اس کی مدح میں ہیں دفتروں کے دفتر گم

کروں نثار دل و جاں، لگاؤں مہر کہاں
تجھے حلف کی پڑی ہے، یہاں ہے محضر گم

○

دعا کرو کہ دعا کا پھر آسرا نہ ملے گا
خدا کو ڈھونڈنے نکلو گے اور خدا نہ ملے گا

بہت گزر چکا ہو گا پلوں کے نیچے سے پانی
کنارہ ایک ملے گا تو دوسرا نہ ملے گا

وہ لوگ ہوں گے جو معدوم، ان کی دھوم تو ہوگی
مگر خبر نہ ملے گی مگر پتا نہ ملے گا

کئی گزر چکے ہوں گے کئی بکھر چکے ہوں گے
مسافروں کا ٹھکانا مسافرانہ ملے گا

جلا کے راکھ اڑا دے گا کوئی تیرے ظفؔر کی
جلا ہوا تو ہے مشکل، بجھا ہوا نہ ملے گا

O

دھنک اوڑھے ہوے جاتا ہے کوئی آسماں کے پار
سواگت کے لیے اک روشنی ہے کہکشاں کے پار

سلیٹی رنگ کے سہمے پرندوں کی طرح شامیں
ہوئی ہیں بے ٹھکانا اک بکھرتے آشیاں کے پار

کوئی قندیل جلتی ہے کہ بہتی ناؤ میں تم ہو
اندھیری رات میں ہوں دم بخود آبِ رواں کے پار

زمینیں ہیں کہیں غلطاں، کہیں آفاق گم گشتہ
مگر ان کے لیے جانا پڑے گا لامکاں کے پار

خدا جانے وہاں پھر کیوں تمنّا ہے سکونت کی
اگرچہ اک نمایاں بے مکانی ہے مکاں کے پار

○

وہ صدائیں دیتا رہا ہو مَیں نے سنا نہ ہو، کہیں یوں نہ ہو
مجھے لگ رہا ہو جدا مگر وہ جدا نہ ہو، کہیں یوں نہ ہو

نہیں کوئی رازِ یگانگی، نہیں کوئی سازِ فسانگی
مگر ایک سازِ فسانہ رازِ یگانہ ہو، کہیں یوں نہ ہو

کوئی ہجرتی غمِ دہر میں، ہو رواں دواں کسی لہر میں
کوئی رہ رہا ہو جہاں، وہاں وہ رہا نہ ہو، کہیں یوں نہ ہو

وہ قرونِ اصل کی ساعتیں، وہ جنونِ وصل کی راحتیں
مرے واسطے ہوں مجھے پتا ہی چلا نہ ہو، کہیں یوں نہ ہو

یہ ادھوری اشیاء اساس تو نہیں اپنے گرد و نواح کی
مگر ان کے رہنے کی اور کوئی جگہ نہ ہو، کہیں یوں نہ ہو

○

لگتا ہے کہ غم سدا رہے گا
غم بھی نہ رہا تو کیا رہے گا

ناپید ہوئے تو ہم ہی ہوں گے
ہر آن وہ رونما رہے گا

اک پل کا تیز رو مسافر
کیا میرے لیے رکا رہے گا

کاغذ کوئی خشک ہو کہ تر ہو
درج اس میں ترا پتا رہے گا

جس رات کی نیند میں نمو ہے
اس رات کا گل کھلا رہے گا

O

زوالِ عمر کو پہنچا ہوں دلبر تک نہیں پہنچا
رواں ہوں صورتِ دریا سمندر تک نہیں پہنچا

بہشتِ گلِ فشاں کی جالیوں تک کیا پہنچتا مَیں
برائے بوسۂ بے تاب، پتھر تک نہیں پہنچا

محبت دور کی آواز تھی، زرخیز، بنجر سی
چلا تو تھا، مگر زرخیز، بنجر تک نہیں پہنچا

مسلسل ایک ہجرت تھی مسلسل ایک تنہائی
سڑک پر سو گیا مَیں، اپنے بستر تک نہیں پہنچا

اگر خود کو مری تنہائیوں میں لا کے دیکھو گے
تو جانو گے کہ شور اندر کا باہر تک نہیں پہنچا

○

اڑائے پھرتی ہے آوارگی ابھی ہر سُو
کہیں رکیں گے تو کر لیں گے چاکِ دل کو رفو

میں رو دیا کہ مجھے یاد آئیں شدت سے
کبھی کبھی تری مجبوریاں کبھی کبھی تُو

اتر رہا ہوں اگر دل سے، سیڑھیوں سے نہیں
تو ٹوٹ کیوں نہیں جاتے یہ پاؤں یہ بازو

یہی تو ہے مرا دل، مجھ گناہ گار کا دل
یہاں نہیں ہے اگر تُو، کہیں نہیں ہے تُو

بکھر رہا ہے مسلسل مرا وجود ظفؔر
نہ زندگی نہ مری شاعری ہی چارہ جُو

○

ملے نہ ہم کو نئے موسموں کے پہناوے
مگر ہم ایسے ملے، ہوگئے بدن ساوے

ادھیڑ ادھیڑ کے ہم نے سیا رفو دل کا
مگر سلجھ نہ سکے خواہشوں کے الجھاوے

نہیں کہ ہم نے محبت میں کچھ بھی پایا نہیں
ہمارے حصّے میں آئے، ہزار پچھتاوے

کچھ ایسا ہے کہ جو سوچا تھا، ویسا ہو نہ سکا
سو ایسے میں، کوئی زندہ رہے کہ مر جاوے

چمن سے دُور نہیں جانے دیتے ہم کو ظفرؔ
قریب آتی ہوئی تتلیوں کے بہلاوے

○

شروع میں تری آنکھوں سے آشنا ہوئے ہم
پھر ان میں کھو گئے اور آپ سے جدا ہوئے ہم

ہم ایک رنگِ محبت تھے اور انمٹ رنگ
پھر ایسے بکھرے، بکھرنے کی انتہا ہوئے ہم

دوبارہ آ گئے ان بازوؤں کے حلقے میں
سمجھ رہے تھے کہ اس قید سے رہا ہوئے ہم

سخن تھے، اور زباں سے ادا نہ ہوتے تھے
ترا کرم کہ نظر سے تری، ادا ہوئے ہم

ہم اپنے آپ سے بیگانہ اڑتے پھرتے تھے
یہ کیا ہوا کہ ترے شہر کی ہوا ہوئے ہم

○

وہ دل گرفتہ تھا آوارگی تو تھی اس میں
اجل نے مار دیا، زندگی تو تھی اس میں

یہ اور بات کہ مَیں اس کے عہد میں نہ جیا
وہ گل بدن تو تھا، دوشیزگی تو تھی اس میں

سپردِ خاک کیا جس چراغ کو ہم نے
بجھا دیا گیا وہ، روشنی تو تھی اس میں

خود اپنے آپ سے تھا حسن اس کا بے پروا
یہ سچ تو ہے، ذرا بیگانگی تو تھی اس میں

کسے خبر تھی ظفؔر جاں نثار کردے گا
اگرچہ تھوڑی بہت سرکشی تو تھی اس میں

○

اور اب ہے شام، بہت دور جا چکی ہے بہار
سفید پھول اٹھاتی ہے خاک سے کوئی نار

قدیم راز کئی، کھل رہے ہیں ہر سُر سے
کسی کی یاد ہے اور بج رہا ہے کوئی گٹار

نشانیاں ہیں بہت حسن کی، اگر دیکھو
کہانیاں ہیں بہت عشق کی، جو چھیڑو تار

ہر اک قلم تری توصیف لکھنا چاہتا ہے
کتاب چاہتی ہے تجھ سے عشق کا اظہار

وہ تشنگاں کے ظفرؔ ہونٹ چھونا چاہتے ہیں
دلوں کے کوزوں میں سنتا ہوں پانیوں کی پکار

O

جنھیں مائیں نہ سینوں سے لگائیں
کھلونے آنگنوں میں چھوڑ جائیں

وہ منظر ہے کہ چھپتا ہی نہیں ہے
کہاں تک اور ہم پردے گرائیں

لگا سکتی نہیں ہیں پار اگر یہ
کہو ان کشتیوں سے، ڈوب جائیں

انہیں ہے یاد ہجرت کی کہانی
چلو سوکھے ہوئے پتّے اٹھائیں

قلم کب تک یونہی سویا رہے گا
ظفؔر دے کاغذِ خالی صدائیں

O

ہمارے واسطے دکھ کا نشان چھوڑ گیا
سفر کٹا تو بدن میں تکان چھوڑ گیا

یہی سمجھنا، جدا ہو گئے ہیں ہم دونوں
زمیں کا ساتھ اگر آسمان چھوڑ گیا

وبالِ جاں ہوا بعد از وصال قرب اس کا
بچھڑ کے خوش ہوں کہ وہ میری جان چھوڑ گیا

بڑھی جو حد سے زیادہ زیادتی اس پر
وہ باغی ایسا ہوا خاندان چھوڑ گیا

ہمارا عشق ظفرؔ رہ گیا دھرے کا دھرا
کرایہ دار اچانک مکان چھوڑ گیا

○

یہ سوچ کے راکھ ہو گیا ہوں
میں شام سے صبح تک جلا ہوں

ہر شخص بچھڑ چکا ہے مجھ سے
کیا جانیے کس کو ڈھونڈتا ہوں

مجھ کو ہے تمیز جھوٹ سچ کی
سچ یہ ہے کہ جھوٹ بولتا ہوں

وہ جاگ رہا ہو شاید اب تک
یہ سوچ کے مَیں بھی جاگتا ہوں

ڈھل جاؤں گا اگلی بارشوں میں
دیوار پہ چاک سے لکھا ہوں

○

ہم سفر جو کھو گئے ان سے ملا سکتے نہیں
کون کس جانب گیا رستے بتا سکتے نہیں

راستے میں پیڑ ہیں، بس دیکھتے جاتے ہیں ہم
ان کے سائے تو ہمارے ساتھ جا سکتے نہیں

نقشِ پا کچھ رفتگاں کے خاک پر محفوظ ہیں
یہ نشانی دیکھ سکتے ہیں اٹھا سکتے نہیں

صرف اتنی بات پر کیوں دوستوں کو چھوڑ دیں
ساتھ دے سکتے نہیں وعدہ نبھا سکتے نہیں

سامنے اک دوسرے کے اور حجاب اتنا ظفرؔ
آئنے نم ہوں تو یہ چہرے دکھا سکتے نہیں

O

برہنگی کا یہ درماں ہے تیرگی میں جئیں
چراغ ہو تو جلائیں، لباس ہو تو سئیں

دلوں پہ حسن کی شبنم اتارنے والے
پیالہ ہو تو اچھالیں، شراب ہو تو پئیں

یہ سادہ دل جو تمہیں دیکھ دیکھ مرتے ہیں
ستم کرو تو دعا دیں، کرم کرو تو جئیں

رفو سے اور دریدہ ہو پیرہن دل کا
تری جھکی ہوئی پلکیں ہی اب اٹھیں تو سئیں

تمہارے حق میں چلو ہم ہی بولتے ہیں ظفر
یہ زہر تم نہیں پیتے تو لاؤ ہم ہی پئیں

○

حد سے بڑھنے لگا ظلم کا سلسلہ، دل نہیں لگ رہا
اس نے احوال پوچھا تو مَیں نے کہا، دل نہیں لگ رہا

شہر میں تو مرے جتنے بھی یار ہیں سب گرفتار ہیں
کس کو معلوم ہے کون ہو، کب رہا، دل نہیں لگ رہا

میں بھی پابند ہوں وہ بھی پابند ہیں، راستے بند ہیں
اب تو ممکن نہیں ہے کوئی رابطہ، دل نہیں لگ رہا

کیسا ہنگام ہے کوئی آغاز ہے اور نہ انجام ہے
جانبِ قتل گہہ دھیان ہے اب مرا، دل نہیں لگ رہا

سرخ ہو جائیں گے جب مرے خون سے پانچ دریا ظفؔر
پھر کہے گی مری طرح خلقِ خدا، دل نہیں لگ رہا

O

ہم سفر کوئی نہیں تو شور و شر کس کے لیے
اے مسافر! یہ صدائے رہ گزر کس کے لیے

خودکشی سے باز رکھا میں نے اپنے آپ کو
مر تو جانا تھا مجھے، مرتا مگر کس کے لیے

کون آتا ہے مرے پیچھے، یہ کیسا وہم ہے
میں ٹھہر جاتا ہوں ہر اک موڑ پر کس کے لیے

یہ جو رنگِ نامرادی کھل رہا ہے چار سو
اے خزاں اس کا سبب کیا ہے یہ زر کس کے لیے

جان دینا اس ستمگر کو، اگر طے ہے تو پھر
دل بناتا ہے محبت کو سپر کس کے لیے

O

نہ ترا خدا کوئی اور ہے، نہ مرا خدا کوئی اور ہے
یہ جو قسمتیں ہیں جدا جدا، یہ معاملہ کوئی اور ہے

ترا جبر ہے مرا صبر ہے، تری موت ہے مری زندگی
مرے درجہ وار شہید ہیں، مری کربلا کوئی اور ہے

یہ ہے ربط اصل سے اصل کا، نہیں ختم سلسلہ وصل کا
جو گرا ہے شاخ سے گل کہیں تو وہیں کھلا کوئی اور ہے

وہ عجیب منظرِ خواب تھا کہ وجود تھا نہ سراب تھا
کبھی یوں لگا نہیں کوئی اور، کبھی یوں لگا کوئی اور ہے

کوئی ہے تو سامنے لایئے، کوئی ہے تو شکل دکھایئے
ظفر آپ خود ہی بتایئے، مرے یارسا کوئی اور ہے

O

اس پہ ظاہر مرا احوال نہیں ہو سکتا
وہ کنارا کبھی پاتال نہیں ہو سکتا

فکر کرنے ہی سے ملتی ہے سخن کی دولت
جو نہیں سوچتا، خوش حال نہیں ہو سکتا

لکھنے والا جو اسے اپنے لہو سے لکھے
کوئی مضمون بھی پامال نہیں ہو سکتا

آب و ماہی کا تعلق ہے فقط آزادی
ان کا ہمدرد کوئی جال نہیں ہو سکتا

شہر اپنا ہے وہی، پہلی محبت ہے جہاں
یہ کراچی تو ظفروال نہیں ہو سکتا

O

چین اک پل نہیں
اور کوئی حل نہیں

کون موڑے مہار
کوئی سانول نہیں

کیا بشر کی بساط
آج ہے کل نہیں

منجمد ہے وجود
کوئی ہلچل نہیں

چھوڑ میری خطا
تُو تو پاگل نہیں

O

محبت ہو نہیں پائی، محبت ہو بھی سکتی تھی
یہ دل دیوانہ بن جاتا تو قربت ہو بھی سکتی تھی

کبوتر قید اگر کرتا ترے جیون کی چھتری کے
ترے بابل کے محلوں پر حکومت ہو بھی سکتی تھی

میں تیرے دھیان کی شمعیں اگر رکھتا نہ ساتھ اپنے
تو اس بارہ دری میں شام غارت ہو بھی سکتی تھی

جہاں تالاب تھے اور حوض میں پریاں نہاتی تھیں
وہ جنّت تو نہیں تھی ویسے جنّت ہو بھی سکتی تھی

خبر کرتا ہوا پہنچا محل کے ساتویں در تک
اچانک جا پہنچتا تو شکایت ہو بھی سکتی تھی

O

جشنِ وصال کی لاکھ سبیلیں اور سنجوگ ہزار
ایک مجھے بس تُو نہیں ملتا، ویسے لوگ ہزار

تیرے دھیان کی دیوالی میں، ہر دم رقص کروں
چھوڑ کے اس نگری کو چاہے، لے لوں جوگ ہزار

حسن کی رغبت سے بھی زیادہ، طاقت عشق میں ہے
جی نہیں بھرتا میرا، چاہے کرلوں بھوگ ہزار

اگر یہاں مرا یار نہ ہو تو رہوں یہاں مَیں کیوں
ساتھ مگر نہیں رہتا چاہے کروں مَیں سوگ ہزار

بھیس بدل کے جوگی والا، گاتا پھرے ظفرؔ
عشق میں روگ ہزار او سائیں عشق میں روگ ہزار

○

کیا زمانہ ہے کہ ہمرنگِ زمانہ ہوے لوگ
اپنے اسلوب سے نکلے تو فسانہ ہوے لوگ

بے لباسی نے بکھیرے جو شب و روز کے رنگ
صبح کے وقت بھی تصویرِ شبانہ ہوے لوگ

ہو کے مدہوش جو آغوش میں وہ آن گرا
کل تھے بے مال و منال، آج خزانہ ہوے لوگ

ایسے لوگوں پہ نثار اپنی زباں کی حرمت
آپ ہی لفظ ہوے آپ ہی معنی ہوے لوگ

جانے والوں کی محبت میں کشش تھی ایسی
ان کی جانب ہی ظفرؔ سارے روانہ ہوے لوگ

O

عبث مَیں آیا یہاں، زندگی یہاں بھی نہیں
جو دل کا نور ہے وہ روشنی یہاں بھی نہیں

یہ کہہ رہے ہیں سبھی، جان کی اماں ہے یہاں
اماں تو ہے، مگر آسودگی یہاں بھی نہیں

میں ایک یاد بھلانے یہاں چلا آیا
مگر وہ یاد بھلائی گئی یہاں بھی نہیں

یہاں بھی آ کے اکیلا بھٹک رہا ہوں مَیں
کسی سے رشتۂ آوارگی یہاں بھی نہیں

ہوئی ہے ختم کہاں جستجو ظفؔر کہ یہاں
خیال تھا، کوئی ہوگا، کوئی یہاں بھی نہیں

○

پڑا نہ فرق کوئی پیرہن بدل کے بھی
لہو، لہو ہی رہا جم کے بھی پگھل کے بھی

بدن نے چھوڑ دیا روح نے رہا نہ کیا
میں قید ہی میں رہا قید سے نکل کے بھی

تہوں کا شور بھی اب سطح پر سنائی دے
وہ جوش میں ہے تو پھر جسم و جاں سے چھلکے بھی

نئی رتوں میں بھی صابرؔ اداسیاں نہ گئیں
خمیدہ سر ہے ہر اک شاخ پھول پھل کے بھی

O

میں تھا ستم زدہ تو ستم گر بھی مَیں ہی تھا
گھایل تھا جس سے جسم وہ خنجر بھی مَیں ہی تھا

اپنے لیے مَیں آپ تماشا بنا رہا
میں جس کو تک رہا تھا وہ منظر بھی مَیں ہی تھا

میرے سوا نہ میرے قریب آ سکا کوئی
خوشبو تھا مَیں تو خود سے معطّر بھی مَیں ہی تھا

خود مَیں نے اپنے سامنے پھیلائے اپنے ہاتھ
داتا بھی مَیں ہی تھا تو گداگر بھی مَیں ہی تھا

کیا تجھ کو یاد ہے کہ پسِ پشتِ کائنات
جس میں اٹھا تھا حشر وہ محشر بھی مَیں ہی تھا

O

عکس پانی میں اگر قید کیا جاسکتا
عین ممکن تھا مَیں اس شخص کو اپنا سکتا

کاش کچھ دیر نہ پلکوں پہ ٹھہرتی شبنم
میں اسے صبر کا مفہوم تو سمجھا سکتا

بے سہارا کوئی ملتا ہے تو دکھ ہوتا ہے
میں بھی کیا ہوں کہ کسی کام نہیں آ سکتا

کتنی بے سود جدائی ہے کہ دکھ ہے نہ ملال
کوئی دھوکا ہی وہ دیتا کہ مَیں پچھتا سکتا

میں نے اوڑھی ہے ترے پیار کی اجرک ایسی
اب تجھے چھوڑ کے پنجاب نہیں جا سکتا

O

عجب اک بے یقینی کی فضا ہے
یہاں ہونا نہ ہونا ایک سا ہے

تغیّر کا عمل جاری ہے یعنی
دکھوں میں کچھ اضافہ ہو گیا ہے

ٹھکانا ہی نہیں کوئی ابھی تک
جو پنچھی اڑ رہا تھا اڑ رہا ہے

ہمارا اس کا اب رشتہ نہ پوچھو
تعلق ہے مگر ٹوٹا ہوا ہے

اگر اک بار کُھل جائے کوئی آنکھ
تو پھر اس کا مقدر جاگنا ہے

O

میں بار بار گیا ہوں خیال سے آگے
ہے اور زندگی اس انتقال سے آگے

اگرچہ ان کا مقدر نہ تھی کوئی منزل
مگر ملے تھے مسافر نڈھال سے آگے

وہ ایک رنگ کہ دایم ثبات ہو جس کو
میں دیکھتا ہوں عروج و زوال سے آگے

مجھے یقیں ہے مقاماتِ سرخوشی ہیں بہت
تری جدائی میں گردِ ملال سے آگے

کبھی نہ چاہا اسے لاجواب کرنا ظفرؔ
میں جا تو سکتا تھا اس کے سوال سے آگے

O

کوئی ڈوبا ہوا جب آ ملے گا
کنارے سے کنارہ جا ملے گا

خدا شاہد کبھی سوچا نہ مَیں نے
کہ تُو پانی میں بھی پیاسا ملے گا

مری آغوش میں آجائے گا تُو
سمندر سے اگر دریا ملے گا

جو ڈھونڈیں گے اثاثہ میرا، ان کو
فقط ٹوٹا ہوا کاسہ ملے گا

بغاوت کی اگر تحریک ہوگی
ظفرؔ زندان میں تنہا ملے گا

○

یہ سنگِ میل نہ ہو اور نقشِ پا بھی نہ ہو
پلٹ کے آؤں تو شاید ترا پتا بھی نہ ہو

جو سچ کہوں تو یہ موجود بے حقیقت ہے
جو ماورا کی تمنا ہو ماورا بھی نہ ہو

میں تیرے نور کو تیرا بدن ہی جانتا ہوں
اگر ہو عکس نہ کوئی تو آئنہ بھی نہ ہو

یہ دل ہو طاق سے گرتے ہوئے دیے کی طرح
کوئی پناہ نہ ہو کوئی آسرا بھی نہ ہو

تھکن سفر کی مقدر ہمارا کیوں ہو ظفر
اگر نہ ہو کوئی منزل تو راستا بھی نہ ہو

O

زندگی تجھ کو سوا جانتے ہیں خواب سے ہم
اور واقف نہیں اس شہر کے آداب سے ہم

شہر آئے تو سمندر نے اسے چھین لیا
عکس لائے تھے جو اک گاؤں کے تالاب سے ہم

ایک دریائے محبت ہے سو اس کے اندر
جب بھی دیکھو گے، ملیں گے تمہیں غرقاب سے ہم

لہر آتی ہے محبت کی، چلی جاتی ہے
سانس بھی کھینچتے ہیں عالمِ اسباب سے ہم

ایک ہی موج میں کب تک کوئی رہ سکتا ہے
نکل آئے ہیں تری یاد کے سیلاب سے ہم

O

اک نئے حوصلے کے ساتھ، صبح کی آس میں رہو
رات گزر ہی جائے گی، ہوش و حواس میں رہو

کیسے کٹے گا یہ سفر، آئے گا کیا ہدف نظر
راہ میں اس طرح نہ تم، خوف و ہراس میں رہو

غیر سے مانگا پیرہن، ایسا ہے جیسے ہو کفن
چاہے لباسِ خاک ہو، اپنے لباس میں رہو

اہلِ یقیں کو چھوڑ کر، پھرنا پڑا ہے دربدر
میں نے کہا نہ تھا کہ مت، اہلِ قیاس میں رہو

کیا ہے وجود کیا عدم، آگے بڑھاؤ تم قدم
راہِ غرور میں نہیں، راہِ سپاس میں رہو

O

خُمارِ شب میں کبھی بے خبر بھی ہو جانا
کتاب اپنے سرہانے ہی دھر کے سو جانا

کسی کنول کی طرح خود ہی تیرنا سرِ آب
ہمارے ساتھ نہانا، ہمیں ڈبو جانا

سراغِ منزلِ ہستی اُسی کے در سے ملا
مزاجِ یار کو جانا تو دہر کو جانا

نظر چرا کے گزرتا ہے اب تو ہر کوئی
عجب نہیں ہے تمہارا خلاف ہو جانا

نئے نئے ابھی آئے ہو اس نگر میں ظفرؔ
چمکتی روشنیوں میں کہیں نہ کھو جانا

○

نکل کے دن سے ذرا دور، رات سے باہر
خرام چاہیے کچھ کائنات سے باہر

بہت قریب سے ہو کر گزر کہ اے خوش رو
تری طلب بھی ہے میری بساط سے باہر

خود اپنی حد سے نکل کر کوئی کہاں جائے
یہ زیست کون کرے ممکنات سے باہر

مرے وجود سے انکار کرنے والو، مجھے
کبھی دکھائی تو دو تم، ثبات سے باہر

کہ تُو ملول ہو خود سے کنارہ کر کے ظفرؔ
نہیں کہ رنگ نہیں کوئی ذات سے باہر

O

اک پل کی بے بسی تو کوئی بے بسی نہیں
ماتم نہ کر کہ زندگی اتنی دکھی نہیں

جو ظلم ہو چکا، نہ تماشا اسے بنا
آسودگی کی دہر میں کوئی کمی نہیں

اک وقت ہے کسی نہ کسی کے ظہور کا
ایسا نہیں، ابھی جو نہیں وہ کبھی نہیں

یہ کس کا انتظار ہے یہ کیسی رات ہے
شمعیں تو بجھ گئیں مگر آنکھیں بجھی نہیں

دیکھو کوئی ستارہ ظفؔر آسمان پر
اجڑے ہوئے مکاں میں اگر روشنی نہیں

○

کیسی آواز کان پڑتی ہے
ایک بے جاں میں جان پڑتی ہے

جب کہیں کچھ نظر نہیں آتا
تیری صورت ہی دھیان پڑتی ہے

دیکھتا ہوں مَیں آر پار اجل
زندگی درمیان پڑتی ہے

آیئے تو خرید لایئے کچھ
راستے میں دکان پڑتی ہے

میں اسی سے رجوع کرتا ہوں
کوئی مشکل جو آن پڑتی ہے

O

تجھے تو جو ہوا معلوم، سو ہوا معلوم
مگر یہ لوگ ہیں کیا اور اِنہیں ہے کیا معلوم

سنہری کرنیں جو بادل کی طشتری میں ہیں
بکھرنے والی کہاں ہیں کسی کو کیا معلوم

نہ کُونج دانہ چُگے اجنبی پرندوں میں
اور ایک تُو کہ سبھی کا ہو آشنا معلوم

ترے خرام سے گھر میں کشادگی آئی
مکان ہونے لگا ہے کُھلا کُھلا معلوم

اسی لیے تو ہوا و ہوس دگرگوں ہیں
نہیں ہے سانس کو آہستہ کھینچنا معلوم

○

وسیع کرتے جو دامن تو فیض اٹھاتا مَیں
کہ خود بھی جاگتا اور تم کو بھی جگاتا مَیں

قدیم راہوں سے آتی جو تھل کی جلتی دھوپ
محبتوں کی نئی چھتریاں بناتا مَیں

دراز سلسلے، روہی سے ریگ زار، کے تھے
لٹا سکا نہ تھا جو زندگی، لٹاتا مَیں

امر سروں کو سمجھتا تھا اس نواح میں کون
تجھی کو نغمۂ روح و بدن سناتا مَیں

نہ یاد آؤ کہ ڈکھ ڈھیر ہے ابھی مرے پاس
میں مر نہ جاتا؟ اگر تم کو بھول جاتا مَیں

○

جب اس کے سامنے سقراط کا حوالہ دیا
تو اس نے بڑھ کے مجھے زہر کا پیالہ دیا

کیا تھا جس نے طلب آخری صحیفۂ عشق
فلک نے اس کو ستاروں بھرا رسالہ دیا

عطا کیا مجھے دن بھر اگر نگاہ کا نور
تو شب ستارہ بدن کا مجھے اجالا دیا

وگرنہ مر چکا ہوتا، مَیں زندہ اس لیے ہوں
کہ دل خدا نے مجھے تجھ پہ مرنے والا دیا

کچھ اور جھیل سکوں دکھ مَیں زندگی کے ظفؔر
ہزار بار مجھے موت نے سنبھالا دیا

O

نجانے کیوں تھی مَیں اس کے بغیر بے کل سی
کہ کھردرا سا تھا وہ اور مَیں تھی مخمل سی

مہک رہے تھے گلاب اس کی گرم سانسوں کے
وہ شام کی تھی گھڑی، شام بھی تھی کاجل سی

جب اُس کے وصل کی حدت مجھے نصیب ہوئی
دہک رہی تھی مَیں اس وقت سرخ صندل سی

وہ میری پیاس بجھانے ازل سے آیا تھا
اور اس کے پاس مرے واسطے تھی چھاگل سی

وہ میری روح میں روپوش تھا کہیں شاید
کہ جس کے ہونے سے پھوٹی، مَیں نرم کونپل سی

○

مری جاں ہے قیدِ طویل میں
کوئی پیڑ جیسے فصیل میں

کوئی پل ستارہ صفت نہیں
مری شامِ عمرِ قلیل میں

ہوں مثالِ ماہیٔ ریگ مَیں
نہ مَیں جال میں، نہ مَیں جھیل میں

ابھی منتشر ہیں اسی طرح
کئی خواب چشمِ علیل میں

اسے خوش نوائی پہ ناز ہے
سو مَیں چپ ہوں اس کی دلیل میں

O

وصال اس کا ابھی حاصل نہیں رنگِ جدائی خوبصورت ہے
سمندر کی طرح گہرا ہے وہ اور انتہائی خوبصورت ہے

رقیب اپنا کسی در سے اگر خیرات پا لے تو یہی کہنا
ترا کشکول اچھا ہے ترا طرزِ گدائی خوبصورت ہے

مثالِ اشک مَیں اس قریۂ بے خواب میں پل بھر رہا پھر بھی
کسی معمار نے یہ آنکھ کی بستی بسائی خوبصورت ہے

اگر مل ہی گئی ہے پرسشِ احوال کی فرصت تو یہ سن لو
ہمارا حال جو بھی ہو تمہاری لب کشائی خوبصورت ہے

محبت میں ظفؔر اس کے چلن کی داد دینا چاہتا ہوں میں
بساطِ بے وفائی جس طرح اس نے بچھائی خوبصورت ہے

O

یہ نہیں ممکن پریشانی نہ ہو
کیا خبر اس آنکھ میں پانی نہ ہو

روبرو ہے اور نہیں ہے رابطہ
آئنے کو کیسے حیرانی نہ ہو

آج تک مجھ سے نہیں لکھا گیا
شعر، جس کا ایک بھی معنی نہ ہو

ایسے جینے سے تو مر جانا بھلا
زندگی ہو اس طرح، یعنی نہ ہو

دل اگر دکھتا ہے دکھنے دو کہ پھر
کیا خبر اتنی بھی آسانی نہ ہو

O

بڑی تیرگی ہے مرے خدا، مری روح میں مری راہ میں
کوئی لَو چراغِ قدیم کی، مجھے لے لے اپنی پناہ میں

جو کشش ہے روحِ ازل کی وہ، نہ کسی طرح کہیں ختم ہو
مجھے چاہے رہنا پڑے کہیں، مَیں رہوں تمہاری نگاہ میں

سرِ راہ صورتِ گرد تھا، مرا جوشِ عشق بھی سرد تھا
پڑا رہتا ورنہ یہیں کہیں، مَیں چلا تمہاری ہی چاہ میں

کھلے بازوؤں سے ہوں منتظر، کوئی دیر کیوں ہے نجانے پھر
کسی پر وقار سلوک میں، کسی پر تپاک نباہ میں

رہو اس قدر نہیں بے خبر، مری آرزو ہے یہی ظفؔر
کبھی اس طرف سے گزر کرو، کبھی آؤ دل کے نواح میں

O

اک دیا جلتا ہوا دیکھا تھا شعلے کے بغیر
لے گیا جانبِ منزل مجھے رستے کے بغیر

وہ محمد ﷺ کی غلامی ہی سے بے شک آیا
اس کا آنا کہاں ممکن تھا وسیلے کے بغیر

جو بھی آئے وہ فقط اس کی رضا سے آئے
بھیجنے والا نہ بھیجے کسی وعدے کے بغیر

آنے والا نہیں آتا ہے حقیقت کے سوا
جانے والا نہیں جاتا ہے نتیجے کے بغیر

جاننے والے کہاں جانیں ظفرؔ بن پرکھے
ماننے والے کہاں مانیں عقیدے کے بغیر

○

خبر ہے گرم کہ ہے آج میرے قتل کی رات
کہاں گئے مرے بازو، کہاں گئے مرے ہاتھ

لگی ہے ضرب تو یوں کانپ اٹھا ہوں مَیں جیسے
الجھ پڑی ہو خود اپنی ہی ذات سے مری ذات

اٹھا رہے ہیں فصیلیں جو دوسروں کے لیے
عجب نہیں کہ انہیں بھی ملے نہ راہِ نجات

ہجومِ غم میں ظفؔر آ گئی ہے یہ نوبت
نہ ضبط ہو سکے مجھ سے، نہ کہہ سکوں کوئی بات

O

آپ کے ذکر سے یہ دل، کھلتا تھا کیسے پھول سا
آج نجانے کیا ہوا، ہو گیا کچھ ملول سا

ویسے تو اک نگاہ میں، ختم تھی ساری گفتگو
دل کا مکالمہ مگر، کھینچ رہا تھا طول سا

سبزہ و گل نہ تھے فقط، راہ میں اس کے منتظر
بیٹھا تھا دم بخود وہاں، مَیں بھی کسی ببول سا

اس کا اتا پتا کوئی، ملنا تھا خیر کیا مجھے
اٹ کے سفر کی دھول میں، ہوگیا آپ دھول سا

کر نہ سکی اثر کوئی، گویا ظفرؔ یہ شاعری
روح کا مسئلہ نہ تھی، شوق تھا اک فضول سا

○

تمہاری راہ کی دیوار تو ہونا نہیں ہم کو
اگر ہم بوجھ بن جائیں تو پھر ڈھونا نہیں ہم کو

ہماری خوش نصیبی ہے تمہاری آن پر مرنا
اگر ہم مر گئے تو دیکھنا رونا نہیں ہم کو

اگر نذرِ زمیں ہوں گے یونہی اجلے رہیں گے ہم
شہیدِ عشق کا ملبوس ہیں دھونا نہیں ہم کو

دوبارہ جو اگاؤ گے دوبارہ فصل دیں گے ہم
مگر پتھر دلوں کے شہر میں بونا نہیں ہم کو

ظفرؔ ہم زندگی ہیں، زندگی اک بار ملتی ہے
اگر مل جائیں ہم تم کو تو پھر کھونا نہیں ہم کو

○

کیا عمارت ہے محبت دو دلوں کے درمیاں
اور خواہش گفتگو کی سیڑھیوں کے درمیاں

کیا کہیں، جاتے ہوے لمحوں کا ساتھی کون ہے
کوئی گرتا جا رہا ہے بازوؤں کے درمیاں

جی رہے ہیں اپنے بچّوں کی جوانی دیکھ کر
بے حرارت دو بدن راتوں دنوں کے درمیاں

عمر بھر کا ساتھ ہے اور گفتگو کوئی نہیں
ایک بت خاموش ہے صورت گروں کے درمیاں

آدمی پتّھر نہ ہو تو ایک ہی صدمہ بہت
کیسے زندہ ہو ظفرؔ اتنے دکھوں کے درمیاں

○

عشق وابستہ ہوا شاخِ نموداری سے
سارا جنگل سلگ اٹھا اسی چنگاری سے

دھیان آتا تھا تمہارا تو چہک اٹھتے تھے
زندگی ورنہ گزاری بڑی بیزاری سے

خود بخود تو نہیں کھلتا ہے کوئی بندِ قبا
کی ہے آسانی یہ پیدا بڑی دشواری سے

سن رہا ہوں کہ قفس میں ہوا ماتم پیہم
ایک آزاد پرندے کی گرفتاری سے

لشکری پال رہے ہیں کئی سانپوں کو ظفرؔ
اور غافل ہیں دل و جاں کی نگہداری سے

○

آپ کے سامنے دم باندھوں نہ کیسے ہر پل
سانس لیتا ہوں تو آداب میں پڑتا ہے خلل

گفتگو آپ کی کرنے لگے مرغانِ چمن
جستجو آپ کی کرنے لگے مریخ و زحل

آپ کی باتوں سے چھلکے ہے کوئی آبِ حیات
آپ کی آنکھوں سے جھلکے ہے کوئی نورِ ازل

آپ نکلے ہیں ادھر سے تو دھنک نکلی ہے
آپ گزرے ہیں ادھر سے تو ہرا ہے جنگل

میں اسے آپ کی رحمت کا سبب جانتا ہوں
سایا کرتا ہوا گزرا ہے جو سر سے بادل

○

میں چاہتا ہوں کہ اس رات کی گواہی دے
کہاں ملے تھے ملاقات کی گواہی دے

ہر ایک رنگ میں تُو ہے ہر ایک انگ میں تُو
میں حق پہ ہوں تو مری بات کی گواہی دے

ترے نصیب میں ہوں مَیں، مرے نصیب میں تُو
کہیں، لکیریں مرے ہاتھ کی گواہی دے

اگر یقین ہے تجھ کو مری محبت کا
مرے وجود، مری ذات کی گواہی دے

میں نفی کرتا چلا جا رہا ہوں اپنی ظفؔر
کہاں ہے تُو مرے اثبات کی گواہی دے

O

شہر میں کون رہا ہے کہ ملا جائے جسے
اب تو وہ، مَیں بھی نہیں، اپنا کہا جائے جسے

میں نے دیکھا وہ بہت دور چلا جاتا ہے
اپنی ہر سانس کے نزدیک رکھا جائے جسے

میں نے دیکھا وہ نہیں ہے تو نہیں ہے، کہیں بھی
سامنے ہو تو لگاتار تکا جائے جسے

زندگی کر سکوں اے کاش حوالے اس کے
صرف جینا ہی نہیں مرنا بھی آ جائے جسے

کیوں نہ ہو جائے ہمیشہ کے لیے چپ وہ ظفرؔ
اپنے لوگوں کی کوئی بات ہی کھا جائے جسے

O

ہر انبساط سے جھلکے وہ بے نیازِ وجود
سمجھنے والے سمجھتے ہیں اس کا رازِ وجود

کسی وجود سے غافل کبھی نہیں رہتا
وہ کار گاہِ جہاں میں ہے کار سازِ وجود

کبھی حدیث کی صورت ظہور میں آئے
بشکلِ وحی کبھی گونجتا ہے سازِ وجود

ہر ایک روپ میں وہ ہے کہ سب ہیں روپ اس کے
کبھی وجودِ حقیقی کبھی مجازِ وجود

اگرچہ داد پہ حسانؓ ہی کا حق ہے ظفرؔ
لیے لیے پھروں مَیں بھی کوئی بیاضِ وجود

○

اس کے سائے سے اگر دُور رہا جائے گا
وہ جو برگد سا مسافر ہے چلا جائے گا

یہ جو بہتا ہی چلا جاتا ہے پانی کا شجر
دور تک سایۂ امواجِ فنا جائے گا

جن درختوں کو ڈبویا گیا دریاؤں میں
ان کی چھاؤں کو کناروں پہ رکھا جائے گا

تُو نہ ہوگا تو محبت کے چناروں کی طرف
دھیان جائے گا مگر کم ہی ذرا جائے گا

سب مسافر کسی شیشم تلے سو جائیں گے
تا بہ منزل کوئی نقشِ کفِ پا جائے گا

○

گئے دنوں کی نشانی مری غزل میں نہیں
جو کٹ گئی وہ جوانی مری غزل میں نہیں

زمانے بھر کے فسانے مری غزل میں ہیں
بس ایک تیری کہانی مری غزل میں نہیں

مجھے تو اشک فشانی ہی سے نہیں فرصت
سو کوئی زہر فشانی مری غزل میں نہیں

چھپا رکھی ہے غزل میں برہنگی اس کی
اسے گلہ ہے معانی مری غزل میں نہیں

مُصر ہوں مَیں کہ ٹھہر پیچ و خم خیال کے دیکھ
وہ معترض ہے روانی مری غزل میں نہیں

O

تمہاری یاد تھی اور شام تھی اسیری کی
کلیجہ چیر رہی تھی صدا ٹیٹری کی

نہ آئیں اس طرف اُڑتی ہوئی ابابیلیں
نہ بے کسی میں کسی نے بھی دستگیری کی

شجر سے ناتا کوئی جیسے کھٹ بڑھئی کا ہو
بندھی ہے ایسے جوانی سے ڈور پیری کی

اڑائیں خاک نہ صحرائے تھر میں کیسے تلور
کہ اختیار سخی لال نے فقیری کی

طیور اداس تھے، پر چند کرگسوں نے ظفرؔ
چمن میں جھوم کے حد کر دی بے ضمیری کی

○

زمیں تک دیکھنا تھا آسماں تک دیکھ آیا ہوں
نجانے وہ کہاں ہے رفتگاں تک دیکھ آیا ہوں

مجھے مٹی سے خوشبو آ رہی ہے آج بھی اس کی
میں اس کے دیکھنے کو، خاکداں تک دیکھ آیا ہوں

کہیں ایسا نہ ہو اس کی مہک گل میں ہو پوشیدہ
خیال آتے ہی اس کو گلستاں تک دیکھ آیا ہوں

کہیں ایسا نہ ہو اس کا نشاں ہو بہتے پانی پر
کنارے سے اسے، آبِ رواں تک دیکھ آیا ہوں

ظفؔر اب زندگی سے آگے اس کو دیکھنا ہوگا
جہاں تک دیکھ سکتا تھا، وہاں تک دیکھ آیا ہوں

O

محبتوں کی نہیں کوئی انتہا معلوم
رواں دواں ہی یہ دریا ہوا سدا معلوم

میں اس چراغ کی لو سے لپٹ کے سو جاؤں
نہ ہو کسی کو مری راکھ کا پتا معلوم

میں اس سے ملتے ہوے اپنا آپ بھول گیا
کنارا جیسے ہو دریا میں ڈوبتا معلوم

میں جس کے واسطے آغوش میں کسی کی گرا
ہوا تھا پھول وہ پوشاک پر کھلا معلوم

نہ کاٹ سر کوئی جس طرح کاٹے سرکنڈے
ہمیں ہے آپ شہادت کا راستا معلوم

○

میں سوچتا ہوں اسے کھو کے کیا مفاد رہا
بدن نباہ کی خواہش میں نامراد رہا

غنودگی سی دمِ وصل تھی کہ وعدۂ شب
نہ اس کو یاد رہا اور نہ مجھ کو یاد رہا

مرے لہو کی لگن میں مگن تھے لب اس کے
وہ میرے ذہن میں جب تک رہا فساد رہا

ہم ایک عمر رہے ایک دوسرے سے جدا
مگر نہ یاد رہا ہم میں کیا عناد رہا

اک اضطراب رگ و پے میں موجزن تھا ظفرؔ
میں اس کی بزم میں غمگیں رہا نہ شاد رہا

O

کسی کے دل میں اترنے کا راستا کوئی ہو
قریب ہے وہ زمانہ کہ آشنا کوئی ہو

میں اسکے ساتھ چلوں، چاہے مَیں بکھر جاؤں
تری تلاش میں نکلی اگر صدا کوئی ہو

میں اس کے ساتھ چلوں اور آسماں چھولوں
کوئی ستارہ ہو یا پھر ستارہ سا کوئی ہو

مری نوا ہی بہت ہے اگر سنی جائے
نہیں ہے کوئی ضروری کہ ہم نوا کوئی ہو

میں زندگی سے بہت دور جا رہا ہوں ظفرؔ
شکست دے جو اجل کو، وہ دلربا کوئی ہو

○

تجھے تو چین ہی آتا نہیں جفا کے بغیر
میں کر رہا ہوں محبت کسی جزا کے بغیر

ترے بغیر بھی کچھ دن گزار ہی لوں گا
گزر گئی ہے بہت زندگی، خدا کے بغیر

میں نرم و گرم طبیعت تری سمجھتا ہوں
ترا گزارا نہیں مجھ سے مبتلا کے بغیر

کھلے گا تجھ پہ یہ کچھ روز میں کہ تُو ایسے
مرے بغیر ہے، جیسے بدن قبا کے بغیر

ظفرؔ ہَوا تھی جدھر کی، ادھر کبھی نہ گیا
مگر مَیں سانس نہیں لے سکا ہَوا کے بغیر

O

دروازہ اجل کا کُھل رہا تھا
جاں دینے پہ کوئی تُل رہا تھا

کیا آنکھوں کا رنگ دیکھتا مَیں
چہرہ تو لہو سے دُھل رہا تھا

اے اہلِ چمن! تمہیں خبر ہے؟
شب کیا زنداں میں غُل رہا تھا

دو دل تو کناروں کی طرح تھے
بیچ ان کے، عشق، پُل رہا تھا

منزل کی طرح ظفؔر ملا وہ
میں جس کے بغیر رُل رہا تھا

○

وہ جو اس طرف سے گزر گیا تو چمن تمام ہرا ہوا
چمن ایسا، جیسے فلک پہ ہو، کوئی طشتِ رنگ دھرا ہوا

ابھی تجھ سے دور ہے زندگی، ادھر آ، سرور ہے زندگی
مری شام بھی ہے سجی ہوئی، مرا جام بھی ہے بھرا ہوا

وہ اگرچہ ایک خیال ہے، مجھے آج بھی یہ ملال ہے
کئی سلوٹوں کا سبب بنا جو قریب اس کے ذرا ہوا

اسے آج بھی جو میں یاد ہوں، مجھے حق ہے یہ کہ جو میں کہوں
مرا سارا کشت پھل ہوا، مرا سارا کھوٹ کھرا ہوا

کوئی کربلا تو نہیں ظفؔر، طرب و خوشی کا ہے یہ نگر
یہ چراغ کیوں ہیں بجھے ہوے، یہ غزال کیوں ہے ڈرا ہوا

O

بدن نہاتا ہوا چاندنی میں دیکھا گیا
یہ معرفت کا عمل بندگی میں دیکھا گیا

• نثار ہوتے گئے تیرے دیکھنے والے
شکوہِ حسن تری سادگی میں دیکھا گیا

جو مہر و ماہِ محبت غروب ہوتے نہیں
انہیں ہمیشہ تری دلبری میں دیکھا گیا

نجانے کس کی طلب تھی، کوئی ستارہ بدن
ہمیشہ حالتِ آوارگی میں دیکھا گیا

گواہی دے وہ نظر، بے نیازِ لعل و گہر
ہمیشہ غرق ظفرؔ شاعری میں دیکھا گیا

O

بے سروساماں رواں ہے کارواں اور ایک مَیں
ناپتا ہے اس زمیں کو آسماں اور ایک مَیں

کس قدر شفّاف پانی تھا جسے گدلا کیا
اس کا باعث، اک ہجومِ تشنگاں اور ایک مَیں

نیند کا جھونکا رواں ہے ماورائے وصل و ہجر
سو گئیں ہیں چیختی تنہائیاں اور ایک مَیں

ایک کمرے میں سماتی ہی نہیں ہے زندگی
دیکھتی ہیں یہ تماشا کھڑکیاں اور ایک مَیں

ربط دریا سے ظفؔر، اب ساحلوں جیسا نہیں
کشتیوں سے کھل گئے ہیں بادباں اور ایک مَیں

○

وہ دور تھا قریب آ گیا تو چین آ گیا
اور آ کے روح میں سما گیا تو چین آ گیا

گھرا ہوا تھا رات اک ہوس بھرے ہجوم میں
نظر، نظر سے وہ ملا گیا تو چین آ گیا

چمن میں پھول پھول سے لپٹ رہی تھیں تتلیاں
وصال رت کا رس چکھا گیا تو چین آ گیا

وصال کے نشے میں ڈولتے بدن کے طاق میں
کوئی دیا سا وہ جلا گیا تو چین آ گیا

خیال تھا کہ لوٹ کر نہ آئے گا وہ اب ادھر
دریچہ دل کا کھٹکھٹا گیا تو چین آ گیا

○

گرفتِ بحر سے باہر نکل نہ جاؤں کہیں
میں سطحِ آب پر آ کر اچھل نہ جاؤں کہیں

میں دوستی ہی نہیں دشمنی بھی کرتا ہوں
خیال رکھ کہ کوئی چال چل نہ جاؤں کہیں

خمارِ وصل اترنے دیا نہ اس ڈر سے
میں تیرے وعدۂ فردا پہ ٹل نہ جاؤں کہیں

ظفرؔ وہ میری جڑیں کاٹنے کی فکر میں ہے
اسے حسد ہے کہ مَیں پھول پھل نہ جاؤں کہیں

O

یہ زمیں بھی خواب ہے یہ آسماں بھی خواب ہے
جو تصوّر میں ہے میرے، وہ جہاں بھی خواب ہے

خواب ہیں سارے محلّے، خواب ہیں سارے نگر
اور پہنچنا ہے جہاں، وہ آستاں بھی خواب ہے

اوّل و آخر ہے کوئی حکمرانی خواب کی
قبل ازیں بھی خواب ہے اور بعد ازاں بھی خواب ہے

چاروں سمتوں ہی کو گھیرے میں لیا ہے خواب نے
میں ہوں ان کے درمیاں اور درمیاں بھی خواب ہے

خواب سے باہر نکلنا چاہتا ہوں مَیں ظفرؔ
یہ طلب برحق مگر اس کا بیاں بھی خواب ہے

O

وہ آج ہے مہرباں نہ کل تھا
اپنے ہی دماغ کا خلل تھا

جا مَیں نے کسی کی پُر نہیں کی
مت جان کسی کا مَیں بدل تھا

اک پل میں گزر گیا مرا وقت
جیسے مرا وقت ایک پل تھا

اب تجھ سے بچھڑ کے رو رہا ہوں
پہلے تو مرا وجود شل تھا

اب تیری طرف سرک رہا ہوں
پہلے تو بہت ہی بے عمل تھا

○

سائل ہیں وہ جو دوسرے سائل کے ساتھ ہیں
باطل سے فائدہ ہو تو باطل کے ساتھ ہیں

حیراں نہ ہو کہ بے خبری بے سبب نہیں
یہ اہلِ ہوش تو کسی غافل کے ساتھ ہیں

اس معرکے میں جیت کی امّید ہے عبث
یہ سرفروش اپنے مقابل کے ساتھ ہیں

سینے میں دفن کر کے سخن ہائے آگہی
خاموش ہوں کہ سب اسی جاہل کے ساتھ ہیں

صابرؔ تلاشِ امن ہے جن اہلِ شہر کو
وہ اہلِ شہر تو سبھی قاتل کے ساتھ ہیں

O

دل میں پیدا ہوئی طلب کوئی
یاد آئے نہ بے سبب کوئی

تتلیاں جس طرف کو جاتی ہیں
اس طرف ہو گا غنچہ لب کوئی

ریگِ صحرا بھی اڑ کے بیٹھ گئی
ان غزالوں سے جیتا کب کوئی

تا قیامت رہے گی خاموشی
کر گیا ہے سخن عجب کوئی

جانبِ دہر مجھ کو لایا گیا
دہر سے جا چکا تھا جب کوئی

O

دن کوئی دن ہو اور نہ کوئی رات، رات ہو
گرد اس کے گھومتی ہوئی ہر کائنات ہو

میں دیکھتا ہوں انفس و آفاق سے ادھر
کیا بات ہو، ادھر بھی کسی سے جو بات ہو

ہر آدمی کے ظرف پہ فطرت کی ہے نگاہ
ڈالے وہ بوجھ، جتنی کہ جس کی بساط ہو

ایسے ہیں جلوہ گر فلکِ مشتری سمیت
یہ کہکشائیں، جیسے کسی کی برات ہو

میں اس کو عمر بھر کے لیے تھام لوں، ظفؔر
لپٹا ہوا جو نور کی چادر میں ہاتھ ہو

○

کالے تیتر نے بول بول کے رات
رکھ دی غمناکیوں میں رول کے رات

گری دستار جس سے واعظ کی
بڑے چرچے تھے اس ٹھٹھول کے رات

نئے زندانیوں کی دیکھے راہ
اپنا دروازہ کوئی کھول کے رات

چلی اپنے نئے ہدف کی طرف
میری صبحوں میں زہر گھول کے رات

تیرگی کے سوا نہ کچھ پایا
میں نے دیکھا اسے ٹٹول کے رات

O

دکھ دے کے مہرباں کو ستم گر سے جا ملا
پتھر تھا وہ جو دوسرے پتھر سے جا ملا

وہ دور ہے تو دکھ ہے مگر یہ ہے دکھ سوا
ہم سے بچھڑ کے وہ کسی کم تر سے جا ملا

تقریر سے تو مل نہ سکی منزلت کوئی
تکرار سے وہ مسند و منبر سے جا ملا

دنیا نے بند کر دیے جب سارے راستے
اک سلسلہ خیال کا دلبر سے جا ملا

کیا ہو گلہ ظفرؔ کسی ایماں فروش سے
جب وہ خدا پرست بھی کافر سے جا ملا

○

اگر بے زبانی کو آواز کرتا
میں اپنے سخن پر بہت ناز کرتا

کواکب مقابل تھے سو اس طرف مَیں
چلا، تیز، تنویرِ الفاظ کرتا

میں سیّارگانِ ازل کا تھا طالب
سو کیا کہکشاؤں سے اغماض کرتا

نکلتا اگر وقت کی قید سے مَیں
تو اگلے زمانوں کے در باز کرتا

فضا ایسی کب تھی ظفرؔ اس چمن کی
میں پَر کھولتا اور پرواز کرتا

O

بدن کی روشنی باہر قبا سے دیکھی گئی
مزید یہ کہ مرے آسے پا سے دیکھی گئی

بدن سے کھیلتی دیکھی گئی وہ ریتلی نیند
نجانے اس کی لگن کس ادا سے دیکھی گئی

یہ انتہائے جمال آج ہی کی بات نہیں
بدن میں اس کی کشش ابتدا سے دیکھی گئی

بدن پناہ میں اس کی ہمیشہ دیکھا گیا
کہ پور پور، وصال و وفا سے دیکھی گئی

بدن نہال ہوا اس کے رنگ رس سے ظفؔر
نوازش اس کی، اسی کی رضا سے دیکھی گئی

○

میں انتظار کروں گا اگر ترا سایہ
بدل کے دھوپ میں لایا نہ دوسرا سایہ

جو میرے واسطے برگد بھی تھا بہار بھی تھا
یہیں کہیں ہے مگر سر سے اٹھ گیا سایہ

ہم ایک جسم تھے اک روح تھے مگر پھر بھی
نہ لب بہ لب ہوا سایہ، نہ پا بہ پا سایہ

بہت سے لوگ ملے ان میں ایک تُو بھی ملا
پھر اس ہجوم میں گُم ہو گیا مرا سایہ

میں اپنے سائے کی خاطر جہاں کہیں بھی گیا
ہر اک جگہ پہ فقط تُو تھا یا ترا سایہ

O

قسمت میں اگر جدائیاں ہیں
پھر کیوں تری یادیں آئیاں ہیں

یاں جینے کی صورتیں ہیں جتنی
وہ صورتیں سب پرائیاں ہیں

فریاد کناں نہیں بس اک مَیں
چاروں ہی طرف دہائیاں ہیں

ہر درجے پہ عشق کر کے دیکھا
ہر درجے میں بے وفائیاں ہیں

اک تیرا بُرا کبھی نہ چاہا
گو ہم میں بہت برائیاں ہیں

O

آنکھ کی سوکھتی سی جھیلوں میں، اپنے دیدار کا کنول رکھ دے
یہ محبت فنا پذیر نہ ہو، ہر ابد کی جگہ ازل رکھ دے

سب رتیں سب سمے ہیں تیرے لیے، آج اور کل بنے ہیں تیرے لیے
رکھ دے اک دن بچا کے میرے لیے، آج ممکن نہیں تو کل رکھ دے

اتنی آسانیوں میں دنیا کی، اتنی نادانیوں میں دنیا کی
خندہ پیشانیوں میں دنیا کی، اپنے ماتھے کا ایک بل رکھ دے

اب سفر بے ارادہ ٹھیک نہیں، گمرہی کا اعادہ ٹھیک نہیں
گھلنا ملنا زیادہ ٹھیک نہیں، وصل میں ہجر کا بھی پل رکھ دے

کیا کہے اور تجھ سے تیرا ظفؔر، زندگانی عزیز ہے تو مگر
تُو کسی اور کا ہے جیون اگر، میری تقدیر میں اجل رکھ دے

O

اک تری یاد رہ گئی باقی
جو ترے بعد رہ گئی باقی

ڈھ گئے دھیان کے سبھی در و بام
صرف بنیاد رہ گئی باقی

سارا احوال کہہ دیا لیکن
ایک فریاد رہ گئی باقی

دل کے جانے کا، جس میں تھا مذکور
وہی روداد رہ گئی باقی

بے سبب تو نہیں جہان میں ظلم
نسلِ شدّاد رہ گئی باقی

O

نوکِ پاپوش پہ رکھتا ہوں مَیں تجھ کو ترے دربار سمیت
سر اٹھائے گا جو نخوت سے تو گر جائے گا دستار سمیت

یہ جو مظلوم ہیں، اتنا بھی نہ کمزور سمجھ تُو ان کو
یہ ترا تخت جلا ڈالیں گے اِک دن ترے گھربار سمیت

جس کے اکسانے پہ اس درجہ ستم تُو نے روا رکھّا ہے
قتل کر دیں گے تجھے لوگ اسی حاشیہ بردار سمیت

اپنی موت آپ ہی مر جائے گا تُو، نام بھی لے گا نہ کوئی
ختم ہو جائے گا ہر ذکر ترے ظلم کے پرچار سمیت

شکریہ تیرا ادا کرنے کا موقع مجھے ملتا کیسے
تُو نے تو سایۂ دیوار عطا کر دیا دیوار سمیت

○

رنگوں میں جو رات ڈھل رہی تھی
ساتھ اپنے مجھے بدل رہی تھی

یا مَیں اسے ایک پل ملا تھا
یا زندگی ایک پل رہی تھی

غنچے کی طرح تھا ساتھ کوئی
خوشبو بھری سانس چل رہی تھی

وہ ڈوب چکا تھا جل میں، لیکن
خوشبو تو کنول کنول رہی تھی

نکلے تھے ظفرؔ چمن سے جب ہم
ہر ٹہنی پھول پھل رہی تھی

O

مری یاد میں ہے اجل نہاں، مجھے بھولنے کی دعا کرو
یہ دعا اگر نہ قبول ہو، مری زندگی سے وفا کرو

مرے صبح و شام سے دور ہے، کسی نور کا جو ظہور ہے
جو ازل ابد کا سرور ہے، مجھے وہ سرور عطا کرو

مجھے تم میں کھونا عزیز ہے کہ تمہارا ہونا عزیز ہے
تمہیں یادِ بھی نہ مَیں رکھ سکوں، مجھے خود سے یوں نہ جدا کرو

ابھی جو فراغِ ستم نہیں، مرے پہلے زخم بھی کم نہیں
کوئی زخم کہنہ کرید دو، چلو یہ تو فرض ادا کرو

مرے حال کی ہے تمہیں خبر، مَیں وہی تو ہوں کہ جو تھا ظفرؔ
مری جان کیا تمہیں ہو گیا، نہ ستم کرو نہ گلہ کرو

O

جو اذن ہو تو مَیں سیّارگاں کے ساتھ رہوں
وگرنہ روہی میں ریگِ رواں کے ساتھ رہوں

مری ترنگ جو تھکنے نہیں مجھے دیتی
یہ کہہ رہی ہے کہ مَیں کارواں کے ساتھ رہوں

بھٹکنے دیتا نہیں ہے مجھے مرا ایماں
میں کربلا میں غمِ جاوداں کے ساتھ رہوں

بلند ہو کے مجھے خاکداں سے، جینا ہے
یہ کیا ستم ہے کہ مَیں خاکداں کے ساتھ رہوں

مقامِ دہر مرا انتخاب تھا ہی نہیں
جو بس چلے تو ظفرؔ رفتگاں کے ساتھ رہوں

○

تجھے جو رنج ہے کچھ اس سے بھی سوا ہے مجھے
خدا نے کیوں تری تقدیر میں لکھا ہے مجھے

ٹھہر گیا ہوں یونہی تیرے روز و شب میں کہ تُو
مثالِ شامِ جدائی گزارتا ہے مجھے

یہ شہر اپنی روایت میں خوبصورت ہے
مگر یہ شہر بھی اک روز چھوڑنا ہے مجھے

گیا تھا دہر سے تحسین سروری جیسے
اسی طرح، کوئی لمحہ پکارتا ہے مجھے

یہ جی میں ہے کہ مروں بھی تو خاک دان سے دور
ظفرؔ میں ایک ستارہ ہوں ٹوٹنا ہے مجھے

○

سفر نہ ختم ہوا اور نڈھال ہو گئے ہم
اور اس سفر میں بہت پائمال ہو گئے ہم

ہمارا لختِ جگر قتل ہو گیا جیسے
مثال ہی نہ رہی بے مثال ہو گئے ہم

جو دیکھتا ہے ہمیں، لاجواب دیکھتا ہے
ہم ایسے کھو گئے، جیسے سوال ہو گئے ہم

اتارنے کے لیے ہو گئے کوئی صدقہ
گزارنے کے لیے ماہ و سال ہو گئے ہم

اگر کمی تھی کوئی زندگی میں، غم کی تھی
وہ غم ملا کہ ظفرؔ مالا مال ہو گئے ہم

O

اندھیرے غار سے آیا ہوں رات اوڑھے ہوئے
مگر وہ شخص کہ نورِ حیات اوڑھے ہوئے

ہر ایک انت سے آگے نکلنا چاہتا ہوں
میں سایۂ شجرِ ممکنات اوڑھے ہوئے

تمام عمر شب و روز کے سفر میں رہا
میں ایک چادرِ رنج و نشاط اوڑھے ہوئے

مجھے جلائے کوئی، میری راکھ اڑائے کوئی
پڑا ہوں مَیں، خس و خاشاکِ ذات اوڑھے ہوئے

مجھے امید ہے، منزل قریب تر ہے ظفرؔ
رواں ہوں گردِ رہِ مشکلات اوڑھے ہوئے

O

وہ کیا عذاب ہے جس سے گزر نہیں میرا
درخت میرے ہیں لیکن ثمر نہیں میرا

جدھر رواں ہوں ادھر تو نہیں مری منزل
جو میرے ساتھ ہے وہ ہم سفر نہیں میرا

تڑپتا چیختا ہر اک وجود کہتا ہے
جدا نہیں ہے جو تن سے، وہ سر نہیں میرا

ذرا سی بھول سے بے خانماں ہوا ہوں مَیں
کوئی گلی نہیں کوئی نگر نہیں میرا

○

اگرچہ ہر کوئی فٹ پاتھ سے گزرتا ہے
مگر کہاں کوئی دن رات سے گزرتا ہے

اگرچہ سنتا ہے کوئی مرے سبھی دکھڑے
مگر کہاں مرے حالات سے گزرتا ہے

نہیں فراغ کہ گزرے وہ خانۂ دل سے
جو شخص ارض و سماوات سے گزرتا ہے

سما گیا جو مرے ہاتھ کی لکیروں میں
وجود اس کا مرے ہاتھ سے گزرتا ہے

ظفرؔ میں روزنِ زنداں سے دیکھتا ہوں اسے
ستارہ جو شبِ ظلمات سے گزرتا ہے

○

کتاب دی ہے تمہیں دیکھو معجزات کُھلے
سو بار بار کرو غور تاکہ بات کُھلے

رکو نہیں یہ جماعت گزر چکی کب کی
چلو کہ تم پہ کوئی راہِ ممکنات کُھلے

نہ پھیر پھیر کے منہ، دیکھو آسماں کی طرف
تمہیں پناہ میں لیں گے ہمارے ہاتھ کُھلے

جو ہو رہے تھے اسی کے، انہی کی بخشش تھی
وگرنہ پھرتے رہے لوگ بے ثبات کُھلے

رکوع و سجدہ کی جا اور اعتکاف کی جا
جو ضوفشاں ہو تو ممکن ہے اس کی ذات کُھلے

○

تری خاطر کہ جب برداشت ہی فرقت نہیں ہوتی
وہاں بھی جا پہنچتا ہوں جہاں عزت نہیں ہوتی

ترے بارے میں پیہم سوچنا، ہے مسئلہ میرا
میں سوچوں اور کچھ، اتنی مجھے فرصت نہیں ہوتی

کسی کا حسن مجھ کو کھینچتا ہے چھوڑ دیتا ہے
تبھی مجھ سے کسی کے ہاتھ پر بیعت نہیں ہوتی

طلب سے بھی سوا وہ مہرباں ہوتا ہے سائل پر
مگر مَیں ہوں کہ میری مانگ میں شدت نہیں ہوتی

کہاں رحمت نہیں ہوتی، کسے معلوم ہے پھر بھی
وہاں رکھا گیا ہم کو، جہاں رحمت نہیں ہوتی

O

اپنے رنگوں میں ڈوب جانے دے
دُور ہوں تجھ سے، پاس آنے دے

دلربائی کا ساز تنہائی
سو اکیلے میں گنگنانے دے

ماضی و حال تو مَیں دیکھ چکا
آنے والے مجھے زمانے دے

پہلی خواہش ہے آخری خواہش
کوئی جینے کی راہ پانے دے

ہیں اجل اور حیات ایک ظفرؔ
ایک ہی رنگ مجھ پہ چھانے دے

○

محبت سب سے پہلے جس نے کی ہوگی، قیامت شخص ہوگا
اب اس آئینے میں چہرہ کوئی بھی ہو، اسی کا عکس ہوگا

چمک انفاس کے بجھتے دیوں میں بے سبب آئی نہ ہوگی
اسی کے دھیان کا شعلہ جلا ہوگا، اسی کا لمس ہوگا

زباں پر اپنے دلبر کے سوا آتا نہ ہوگا نام کوئی
جہاں بھی مدرسہ آغاز ہوگا عاشقی کا درس ہوگا

انہی دو حالتوں میں پھڑ پھڑاتا ہے پرندہ آرزو کا
طلوعِ مہر ہوگا اس قفس میں یا غروبِ شمس ہوگا

نصیب اس کو مکمل سرخوشی ہوگی ظفؔر دیوانگی میں
کہ جس دم حسن ظاہر ہو رہا ہوگا وہ محوِ رقص ہوگا

○

آیا وہ یوں قریب نفس در نفس کہ بس
شامل تھا ہر نفس میں وہ سنجوگ رس کہ بس

قربت کے ایک پل میں سمٹ آئے اس طرح
دوشیزگی میں ڈوبے وہ سولہ برس کہ بس

اس کے وصال نے تو کیا ہر طرح نہال
روح و بدن پہ اس طرح اپنا تھا بس کہ بس

کلیوں کو روندتا ہوا گزرا ہر ایک شخص
ایسی چلی چمن میں ہوائے ہوس کہ بس

جی چاہتا نہیں کہ رہائی ملے ظفرؔ
اپنی کشش میں عشق ہے ایسا قفس کہ بس

O

بلا کا حسن ہے اس شہر میں مگر وہ شخص
کمی نہیں ہے کوئی دہر میں مگر وہ شخص

نظر میں گھوم رہا ہے بہشت کا منظر
نہائے چاند کوئی نہر میں مگر وہ شخص

عجب ہیں راہ کی رنگینیاں کہ مَیں جن سے
گزر رہا ہُوں کسی لہر میں مگر وہ شخص

میں اس نواح میں رہتا ہوں اس لیے مغموم
نہیں ہے کوئی یہاں قہر میں مگر وہ شخص

میں زندہ ہوں کہ وہ زندہ مرے لیے ہے ظفرؔ
میں ڈوب جاؤں کسی زہر میں مگر وہ شخص

○

میں جا سکا نہ ادھر عمر کی روانی میں
کسی نے یاد کیا تھا مجھے جوانی میں

میں اس سے دور اکیلا اداس بیٹھا تھا
نہیں تھا کوئی بھی کردار اس کہانی میں

نہ بے سبب ہوا میرا ستارہ برگشتہ
کمی تھی کوئی ضرور اس کی مہربانی میں

میں اس کی سمت بڑھا ہونٹ چومنے کے لیے
عجیب حسن تھا اس کی غلط بیانی میں

میں جاؤں اس کی طرف، سوچتا ہوں اب بھی ظفرؔ
ابھی وہ ڈوبا نہیں ہوگا بہتے پانی میں

O

ترا سنہری بدن رات بھر چمکتا ہے
اسی کی لاٹ سے دل کا نگر چمکتا ہے

اجالتا چلا جاتا ہے کون رستہ مرا
چراغ۔ہے کہ رخِ ہم سفر چمکتا ہے

میں چلتا ہوں مگر اس تک پہنچ نہیں پاتا
کہیں کہیں کوئی تھل میں شرر چمکتا ہے

اگرچہ چھائے دھندلکا، اگرچہ چھائے غبار
مگر سراب تو ہر گام پر چمکتا ہے

تم آکے دیکھو کہ آتش کدے میں دل کے ظفرؔ
علاقہ پاس کا، شام و سحر چمکتا ہے

○

نہ دل گیا نہ زمانے کا غم ہوا معلوم
جو تُو گیا تو ہوا ایک سانحہ معلوم

نہ دھیان دوں تو نہ جائے تمہاری جانب دھیان
اور آئے دھیان تو ہو دل کو چیرتا معلوم

ترے بغیر گزاری ہیں گو کئی عیدیں
مگر جدائی جدائی ہے، یہ ہوا معلوم

وداع کرنے کا ہے حوصلہ کہاں مجھ میں
کوئی وداع ہوا تو مجھے ہوا معلوم

لحد کو کھول کے دیکھوں مَیں اس کا چہرہ کیا
وہ دیکھے گا کہ نہ دیکھے گا مجھ کو کیا معلوم

O

ایسا کھلا وصال کا گلزار ایک رات
یکدم مہک اٹھے در و دیوار ایک رات

وہ رات شبنمی تھی نہ بادل فلک پہ تھے
پڑتی رہی دلوں پہ مگر پھوار ایک رات

یوں ہی نہیں فلک پہ یہ تابندہ کہکشاں
گزرا تھا اس طرف سے مرا یار ایک رات

آتی رہی ہو سنگ بکف جیسے اس کی یاد
ٹوٹا نگار خانۂ پندار ایک رات

گندم کی بالیوں میں بجو کے خوف سے
اس نے کیا وصال سے انکار ایک رات

O

نگاہ کرنے میں لگتا ہے کیا زمانہ کوئی
پیمبری نہ سہی، دکھ پیمبرانہ کوئی

اک آدھ بار تو جاں وارنی ہی پڑتی ہے
محبتیں ہوں تو بنتا نہیں بہانہ کوئی

میں تیرے دور میں زندہ ہوں تُو یہ جانتا ہے
ہدف تو مَیں تھا مگر بن گیا نشانہ کوئی

اب اس قدر بھی یہاں ظلم کو پناہ نہ دو
یہ گھر گرا ہی نہ دے دستِ غائبانہ کوئی

اجالتا ہوں مَیں نعلینِ پائے لختِ جگر
کہ مدرسے کو چلا علم کا خزانہ کوئی

○

روشنی سے ہوا ظاہر کہ وہ ٹھہرا تھا کہاں کمرے میں
جگمگاتے ہیں ابھی تک ترے آنے کے نشاں کمرے میں

میں نے خالی نہیں رہنے دیا کمرے کو، ترے بعد کبھی
تُو نہیں تھا تو - تری یاد کی دنیا تھی جواں کمرے میں

تُو چلا جاتا تو آجاتی مجھے نیند بھی روتے روتے
اب تو سونے نہیں دیتا ترے ہونے کا گماں کمرے میں

ایک بڑھتا ہوا اظہار ہی مقصود فقط وصل کا تھا
سانس روکے ہوئے دو جسم تھے، ٹھہرا تھا سماں کمرے میں

کبھی اس نے بھی زباں کمرے سے باہر نہیں کھولی صابرؔ
میرے دل میں بھی جو آیا وہ کیا مَیں نے بیاں کمرے میں

○

دل ریت پہ تیرتا بھنور ہے
یہ دشتِ جنوں ہی اس کا گھر ہے

دیکھی تری شان تو یہ جانا
زندان میں زندگی امر ہے

پنچھی نہیں گو ابھی قفس میں
ٹوٹا ہوا ایک ایک پَر ہے

خود رستا بنا رہے ہیں اپنا
رہبر ہے نہ کوئی ہم سفر ہے

ہے دار کو پار کرنا باقی
منزل تو ظفرؔ قریب تر ہے

○

وہ بدن نہیں تھا چھوا ہوا، وہ خیال سوچا ہوا نہ تھا
اسے ایک بار جو چھولیا تو پھر اس سے کوئی گلہ نہ تھا

کوئی سرد رات ملن کی تھی، کوئی گرم بات لگن کی تھی
وہ چراغ سا جو وجود تھا، ابھی پوری طرح جلا نہ تھا

کسی جستجو میں حیات تھی، کسی آرزو کی برات تھی
یہ مگر عجیب ہے واقعہ، وہ سہاگ رات رکا نہ تھا

کسی لالٹین کی روشنی جو برآمدے سے پلٹ گئی
مجھے اس سے تیری خبر ملی، مرے پاس تیرا پتا نہ تھا

ظفرؔ اتنی دور تھی زندگی، کسی غم سے چور تھی زندگی
تُو نہیں تھا ساتھ تو کیا ہوا، مرے ساتھ میرا خدا نہ تھا

O

جیون ایک ترنگ ہے سائیں، جیون ایک ترنگ
جیسے پیاس کے صحرا میں ہو، ساون ایک ترنگ

نس نس میں جب مرشد بولے، نس نس ایک دھمال
تن من میں جب عشق رچا ہو، تن من ایک ترنگ

رقص جہاں ہے میرا، وہ ہے، محفل ایک سرور
عکس جہاں ہے تیرا، وہ ہے، درپن ایک ترنگ

پہلی بار تجھے دیکھا تو چھایا ایک خمار
صاحباں اور مرزے کا جیسے، بچپن ایک ترنگ

تم ہو اپنی دھن میں کھوئے، تم ہو ایک فقیر
انگ سے انگ ملا کے دیکھو، جوبن ایک ترنگ

○

جانے والا جا رہا ہے مَیں کہاں تک ساتھ جاؤں
یہ زمیں چھوڑے اگر تو آسماں تک ساتھ جاؤں

زندگی بے اختیاری اور اجل بے اعتباری
خاک میں رہتے ہوئے مَیں خاکداں تک ساتھ جاؤں

وہ ہجومِ کارواں میں جا کے گم ہو جائے چاہے
مجھ پہ لازم ہے کہ اس کے کارواں تک ساتھ جاؤں

اک ہوائے تند خو میری گواہی چاہتی ہے
دیکھنے گل کا بکھرنا گلستاں تک ساتھ جاؤں

اک دوراہے پر ظفرؔ یہ طے نہیں کر پا رہا ہوں
میں یقیں تک ساتھ جاؤں یا گماں تک ساتھ جاؤں

O

خاک دھول ایسی ہے گرچہ رہ گزر کی زندگی
پھر بھی ہے مجھ کو عزیز اک ہم سفر کی زندگی

رفتہ رفتہ کھو رہی ہے سارے آنگن کی کشش
ریزہ ریزہ ہو رہی ہے بام و در کی زندگی

پانیوں سے دور ہوتے جا رہے ہیں تشنگاں
کربلا سے مل رہی ہے اس نگر کی زندگی

سانس آتی ہے کہ آتی ہے کوئی ریگِ رواں
زندگی ایسی ہے اب جیسے ہو، تھر کی زندگی

دیکھتا ہوں مَیں، ظفؔر پر بند ہے بابِ قبول
اور باقی رہ گئی ہے لمحہ بھر کی زندگی

○

کہاں ہے تُو کہ ترے ہم سفر ٹھہر چکے ہیں
یہ آنکھیں بکھریں نہیں خواب سب بکھر چکے ہیں

عوام سوچ رہے ہیں کہ ہم کدھر جائیں
یہ رہ نما تو حکومت سے ڈیل کر چکے ہیں

ستا رہا تھا بہت، جن کو بے گھری کا ملال
امیرِ شہر کی آغوش میں اتر چکے ہیں

چلے بھی آؤ ہمارے بنائے رستوں پر
ہم اپنے عہد کے زندان سے گزر چکے ہیں

طلوعِ صبح کے منظر جو ڈھونڈتے ہو یہاں
وہ کارگل کے زمستان میں ٹھٹھر چکے ہیں

O

مرے شعور وہ اعجازِ خوش نوائی دے
میں اپنے دل میں جو سوچوں اسے سنائی دے

برہنگی سے بچا اے مرے خدا مجھ کو
میں آبجو ہوں مرے جسم و جاں پہ کائی دے

تمام شہر طرف دار ہو گیا اس کا
کوئی نہیں جو اسے طعنِ بے وفائی دے

ہزار عکس ہیں میرے، ہزار نقشے ہیں
مگر وہ پھیر لے آنکھیں تو کیا دکھائی دے

جواب اس کے تغافل کا اس کو دوں صابرؔ
اگر وہ مجھ کو مجالِ گریز پائی دے

O

پہلے تو مثلِ خواب اسے ہم سفر کیا
پھر میں نے اس کو جاگتی آنکھوں بسر کیا

آوارگی شناس نہ تھا دستِ کوزہ گر
شاید اسی لیے مری مٹی کو تر کیا

دنیا ہو دیں ہوئے ہو غرض کوئی نشہ ہو
جس نے کیا خراب ہی مجھ پر اثر کیا

اب رہ گزر میں کوئی کروں گا نہ فیصلہ
یہ فیصلہ بھی مَیں نے سرِ رہ گزر کیا

بے خوف ہی مَیں اس سے ملا جب کبھی ملا
پیدا پھر اپنے دل میں ظفرؔ مَیں نے ڈر کیا

O

الفاظ کے بغیر اگر شاعری کروں
چھوٹے لغت سے جان، عجب زندگی کروں

قبل اس کے، کوئی میرا برادہ بکھیر دے
میں مثلِ چوبِ خشک جلوں، روشنی کروں

جب ہم کلام ہو وہ اجنتا کی مورتی
میں روحِ سنگسار کی منظر کشی کروں

جس میں مرے سوا کوئی موجود ہی نہیں
کیا ایسی کائنات سے پہلو تہی کروں

سانسوں کو لفظیات کے سانچے میں ڈھال کر
تخلیق ایک روحِ تغزل نئی کروں

O

چل رہا ہوں مَیں بہتے دھارے پر
دوست ہے دوسرے کنارے پر

درشن آٹھوں پہر ہے چاروں طرف
میں ہوں قربان ہر اشارے پر

دہر میں رہ کے ماورائے دہر
آنکھ رکتی نہیں نظارے پر

کوئی پروانہ کیا گواہی دے
جان دیتا ہوں مَیں شرارے پر

اپنی جا سے ظفؔر ہلا ہی نہیں
اور رکھا قدم ستارے پر

O

وہی شجر ہیں وہی فاختائیں ہیں اور شام
جوان بیٹوں کی رہ تکتی مائیں ہیں اور شام

سلگ رہے ہیں مہ و مہر حمد کرتے ہوے
درِ قبول سے لپٹی دعائیں ہیں اور شام

ستارے ہیں کہ پرندے جو چمکیں بیچ ان کے
ہوائیں اور ہے شام اور گھٹائیں ہیں اور شام

تلاش کرتے ہیں کرنوں کو رینگتے سائے
شکستہ ہوتے دلوں کی صدائیں ہیں اور شام

گزر رہے ہیں لگاتار ماتمی لمحے
اور اپنی اپنی ظفرؔ کربلائیں ہیں اور شام

O

اب کوئی لَو نہیں مرے اندر
رہ گیا ہوں چراغ سا بجھ کر

وہ بھی حالات کا ہے مارا ہوا
میں بھی ہوں ایک تیر کی زد پر

اس کا مضمون جان لیتا ہوں
خط جو لاتا نہیں ہے نامہ بر

اور چاہوں کہ ساتھ اس کے رہوں
خاک اڑاؤں ہوا میں مٹھی بھر

ساری چیزیں ظفرؔ میں دیکھ سکوں
پاس آئے جو دور کا منظر

O

مسلسل لکھتا جاتا یا مسلسل بولتا جاتا
محبت کے مسائل کی گرہ مَیں کھولتا جاتا

خیال آتا کہ میرے ہم سفر مجھ تک پہنچ جائیں
سرِ منزل اگر پتھر بدن کو رولتا جاتا

سواگت کے لیے آتے کئی بے نشہ دیوانے
میں گھر ہی سے اگر اس میکدے تک ڈولتا جاتا

مسافت بے مزہ ہونے سے پہلے منزل آجاتی
سماعت میں وہ باتوں کا اگر رس گھولتا جاتا

محبت امتحاں لیتی ہے دل کا تو ظفؔر وہ بھی
نگاہوں کے ترازو میں مرا دل تولتا جاتا

○

عشق سے دل ہے تہی، لب ہے دعا سے خالی
کیا لگے جی کہ ہے جاں، اس کی عطا سے خالی

کس کے نقشِ کفِ پا سے کوئی منزل پائے
راستے ہوگئے نقشِ کفِ پا سے خالی

ایسے جینے کو بھلا کیسے مَیں جینا مانوں
زندگانی ہے مری، اس کی وفا سے خالی

میں ہوں غافل تو وہ ہے مجھ سے زیادہ غافل
خوش رہے وہ کہ نہیں وہ بھی انا سے خالی

چلو اتنا تو ظفرؔ ہے مجھے اعزاز نصیب
زندگی کا نہیں رخ کوئی، خطا سے خالی

○

دیئے بجھیں تو جلائیں وجود کی شمعیں
اور ایسی باتیں ہوں، مغموم لڑکیاں تو ہنسیں

کھلا کہ قیدِ محبت اُسے بہت تھی عزیز
چمک رہے ہیں کڑے، اس کے دونوں ہاتھوں میں

ہوائے دشتِ جدائی کی فکر سے پہلے
ہم اپنے خیمۂ دل کی طناب تو کھینچیں

مرے جزیرۂ دل پر وہ اس لیے نہ رکے
اسے اچھال کے رکھتی ہیں دھیان کی لہریں

اگرچہ طے ہے کہ ایندھن ہیں ہم محبت کا
سمجھ میں پھر بھی نہ آئے ظفؔر جلیں کہ بجھیں

○

سولو سایۂ گل میں اور سپنوں کو اس پہ نثار کرو
کھولو پھر تم آنکھیں اور آنکھوں کو اس پہ نثار کرو

میرؔ دلِ پرخوں کی گلابی سے جوں رہے شرابی سے
گھولو دل رنگوں میں اور رنگوں کو اس پہ نثار کرو

چھوڑو بے لذت مدہوشی کو، بے سود خموشی کو
بولو پیار کی بولی اور باتوں کو اس پہ نثار کرو

عشق میں جیسے عمر گزاری ہے، بے انت خماری ہے
ڈولو تم نیندوں میں اور نیندوں کو اس پہ نثار کرو

کیسے محملِ خاص میں جاتے تھے اور کیسے آتے تھے
کھولو یاد کی گٹھڑی اور یادوں کو اس پہ نثار کرو

O

یوں ہی نہیں سبھوں نے بنائیں کہانیاں
پرچھائیوں میں گم تو رہی ہیں جوانیاں

مت اشک بار ہو کہ میں آؤں گا اُن دنوں
جس رت میں پربتوں سے اترتی ہیں رانیاں

جانا ہے سوہنی کو مہینوال کی طرف
طغیانیاں، چناب میں ہوں یا روانیاں

پردے میں کوئی روپ ہے، آنگن میں دھوپ ہے
اور رک گئی ہیں چھاچھ بلوتی مدانیاں

کیسے قدم بڑھائیں ظفر خوش دلی کے ساتھ
ماضی میں رہ گئی ہیں ہماری نشانیاں

○

مر تو مَیں اس ہی دن گیا تھا
جب اس کا خیال چھن گیا تھا

جانا ہے سبھی کو، مانتا ہوں
دکھ یہ ہے وہ میرے بن گیا تھا

عاجز مَیں شمارِ یک نفس سے
وہ آخری سانس گن گیا تھا

ہستی کی ہوس نہ تھی کہ وہ شخص
بیگانۂ سال و سن گیا تھا

رکنے میں بھی زندگی کہاں تھی
گرچہ تھا سفر کٹھن، گیا تھا

O

کبھی یوں لگا کہ وہ دن ڈھلا، کبھی یوں لگا کہ وہ پَو پھٹی
اسی چل چلاؤ میں زندگی، کٹی یوں کہ جیسے نہیں کٹی

کسی جھٹپٹے میں رہے سدا، نہ کھلا کہیں بھی درِ وفا
کبھی صبح خاک میں تھی ملی، کبھی شام دھول میں تھی اٹی

نہ تھا کوئی وارثِ خاکداں، نہ تھا کوئی حارثِ مہرباں
کہ ہزار بار نگر لٹا کہ ہزار بار زمیں بٹی

تری دوستی پہ یقیں رہا، نہ کھلا کہ تُو وہ نہیں رہا
اسی واسطے یہ گماں ہوا کہ ہماری قدر نہیں گھٹی

کوئی آسمان دکھائی دے نہ کوئی زمین سمجھائی دے
ابھی ابر جیسے نہیں کُھلا، ابھی دھند جیسے نہیں چھٹی

O

تُو اگر آغاز ہے انجام ہو جاؤں گا مَیں
دیکھنا اے دل کہ تیری شام ہو جاؤں گا مَیں

ڈول جائیں گے ترے بازو ترازو کی طرح
اور تیرے سامنے نیلام ہو جاؤں گا مَیں

تیری حیثیت بڑھا دوں گا گھٹا کر اپنی قدر
خاص ہو جائے گا تُو اور عام ہو جاؤں گا مَیں

تُو کہے گا تو کبھی مقطع نہ لکھوں گا ظفر
شاعری کے باب میں بے نام ہو جاؤں گا مَیں

○

خود سے کرتا ہوں گفتگو کئی بار
جیسے کتبے سے ہم کلام، مزار

اس تغافل پہ غور کیجے گا
گرتی جاتی ہے دھیان کی دیوار

کوئی غنچہ نہیں رہا باقی
سوکھے پتّوں پہ چل رہی ہے بہار

خاروخس کی طرح ہوں کیوں سرِ آب
کون ہے میرا منتظر، اس پار

ساری چیزیں ظفؔر ہیں اپنی جگہ
کوئی منظر نہیں نظر پر بار

O

مرا دل بہت ہے دکھا ہوا، مجھے مسکراتے ہوئے ملو
جو لگن کی لَو کو اجال دے، وہ دیا جلاتے ہوئے ملو

نہیں پاس تم، نہیں دور تم، سنو ایک بات ضرور تم
کبھی پاس آتے ہوے ملو، کبھی دور جاتے ہوے ملو

جو وفا کا عہد نبھائیں گے، وہ دیارِ نور کو جائیں گے
انہیں خلوتوں میں پناہ دو، انہیں دل لبھاتے ہوے ملو

ہوں قریب عشق کی رمز سے، نہیں دور گنبدِ سبز سے
جو پرندگاں سے ملوں، کہوں، ذرا چہچہاتے ہوئے ملو

نہیں عاقبت سے مَیں بے خبر، مرا دل درود پڑھے ظفؔر
میں جہاں ملوں تمہیں مدح خواں، وہاں دف بجاتے ہوے ملو

O

مل نہ سکے ہم کوزہ گر سے، ایسے ہوے وچھوڑے
تم چاہو تو بیچ دو ہم کو، ہم ہیں گھگّو گھوڑے

ترک تیاگ کی منزل دیکھی، دیکھی بزم آرائی
رہتا نہیں کسی دَر کا وہ، یار کا دَر جو چھوڑے

جو بھی پار لگانے آئے، کچّا گھڑا دے جائے
جو بھی لہر چناب کی اٹھّے، آس وصال کی توڑے

ایک ہی بار وہ پوری کر دے، وصل کی خواہش ساری
بیلنے اندر گنّا جیسے، ایسے جسم نچوڑے

بن دیدار کہاں کٹتی ہے، جیون کی تنہائی
صابر ظفؔر کہو سانول سے، ادھر مہاڑ وہ موڑے

O

حاضر ہے میرے دل کا کنول یار کے لیے
کھلتا ہو چاہے ایک ہی پل یار کے لیے

یہ اعتکاف چھوڑ، کسی روز شہر میں
کرتا ہوا تُو رقص، نکل یار کے لیے

کیا جانے کس گھڑی کرے اشنان، اس کی یاد
اجلا ہی رکھنا من کا یہ جل یار کے لیے

ممکن تھا کوئی اور گھروندا بناتا مَیں
بنتا اگر نہ تاج محل یار کے لیے

اے کاش اس کے عہد میں ملتی مجھے حیات
کرسکتا وقف مَیں، کوئی پل یار کے لیے

O

تجھ سے بچھڑ کے ایسا بکھرا، مَیں تیرے دن رات میں
جیسے خوشبو امانت رکھ دے، کوئی ہوا کے ہاتھ میں

قوسِ قزح میں شامل ہوتے، ہم دونوں کے رنگ بھی
صورتِ ابر اگر تُو مجھ سے، کُھل جاتا برسات میں

ساحل سے ٹکراتے ہیں وہ، رہتے ہیں جو سطح پر
تم اگر اتنے گہرے ہوتے، آتے کیوں جذبات میں

زخم کریدنے مل بیٹھے ہیں، بھولے بھٹکے یار بھی
ویسے تو سب گم رہتے ہیں، اپنی اپنی ذات میں

شعر کی لذت بانٹنے والے، کاش ظفر یہ جانتے
کارِ سخن آغاز کیا تھا، مَیں نے کن حالات میں

O

کروشیئے سے کڑھائی کے ڈھنگ اُسے بھولے
کہا جو مَیں نے کہ آ میرے تارِ دل چھو لے

کوئی ترنگ ہی باقی نہیں کسی دل میں
دکھائی دیتے ہیں خالی اسی لیے جھولے

کہیں بھی کوئی نہ چوبِ خیالِ خشک جلی
ہمارے دل کی طرح تھے بجھے ہوئے چولھے

ہوئے تھے سوکھ کے کانٹا مگر وہ جانِ بہار
جو مہرباں ہوا، سرسوں کی طرح ہم پھولے

میں ان کے ساتھ اڑوں اور بے نشاں ہو جاؤں
جدھر بھی جائیں ظفؔر یہ دھوئیں کے مرغولے

O

اگر کبھی ترے بیمار خیریت لکھتے
ہمیں بتا کہ وہ خط کس کی معرفت لکھتے

اجازت اتنی تو دیتے ہمیں مسائلِ زیست
کسی کی موت پہ مضمونِ تعزیت لکھتے

یہ تُو نے اچھّا کیا خود لکھا تمام پیام
وگرنہ لوگ تو ہر بات من گھڑت لکھتے

ظفرؔ، گلہ ہی نہ رہتا کوئی کسی سے، اگر
ہمیں جو خود سے ہے، وہ بھی منافقت لکھتے

O

بنالوں کاش محبت سے تیرے گرد فصیل
کہ آرزوئیں زیادہ ہیں اور عمر قلیل

ہزار بار اگر چُھو سکوں بدن تیرا
ہزار بار جلے ایک رات میں قندیل

دوبارہ کیسے ملے تیرے بازوؤں میں پناہ
دوبارہ ہو، مری تقدیر کس طرح تبدیل

میں تیری سمت بھی کاش اک قدم اٹھا سکتا
اگرچہ میں نے کیا ہے سفر ہزاروں میل

وگرنہ یوں ہی سسکتے رہیں گے روح و بدن
کسی طرح کوئی پیدا وصال کی ہو سبیل

○

مرا ستارہ نہیں میری رات سے باہر
میں جاؤں کس کے لیے کائنات سے باہر

مبارک ان کو ہوں، جن کے لیے چمکتے ہیں
ستارے ہیں بھی اگر شش جہات سے باہر

گزر کے دیکھتا ہوں بر شگالِ وصل سے مَیں
کوئی دھنک نہیں رنگِ نشاط سے باہر

ضرور دیکھتے ہوں گے جو دیکھ سکتے ہیں
مرا ستارہ حیات و ممات سے باہر

مجھے تھی جس کی طلب، مجھ میں آ بسا ہے ظفؔر
میں دیکھتا ہی نہیں اپنی ذات سے باہر

○

وہ صحرا بھولنے والا نہیں ہے
کہ پیاسا بھولنے والا نہیں ہے

نظر انداز کر سکتے ہیں لیکن
نظارا بھولنے والا نہیں ہے

ہماری موت کا ہے گو تماشا
تماشا بھولنے والا نہیں ہے

اگر ہم واقعہ وہ بھول جائیں
زمانہ بھولنے والا نہیں ہے

وہ آنکھیں بھولنے والی نہیں ہیں
وہ چہرا بھولنے والا نہیں ہے

O

جو چھیڑتا ہے کوئی، صوتِ سرمدی کا ساز
تو مجھ کو لگتا ہے میری ہی زندگی کا ساز

گناہ کو نہ سمجھ رحمتوں کی آرائش
کہ بج رہا ہے ترے دل میں گمرہی کا ساز

کسی کسی کو شعورِ سرودِ برحق ہے
کسی کسی کا مقدر ہے آگہی کا ساز

خدا ہے گھر میں تو پھر گھر سے دور مت جاؤ
یہیں بلند کرو اس کی بندگی کا ساز

وہ بولتا ہے ظفؔر کیسے کیسے رنگوں میں
جو سن سکو تو سنو اس کی خامشی کا ساز

O

سوچتے کیا ہو توڑ دو یہ فصیل
زندہ رہنے کی اب یہی ہے سبیل

کھا چکے ہیں شکست سب مہرے
اب تو کیجے بساط ہی تبدیل

دکھ تو یہ ہے کہ آپ بھی چپ ہیں
ہو رہی ہے حیات کی تذلیل

کاش وہ زندگی بھی دیکھتے آپ
آنسوؤں میں جو ہوگئی تحلیل

آپ افسوس، ٹس سے مس نہ ہوئے
چل کے آئے تھے ہم ہزاروں میل

○

شادمانی شادمانی تم پکارو شادمانی ہے کہاں
زندگانی کی ہوس میں جی رہا ہوں زندگانی ہے کہاں

پیاس میری جس کی لہروں سے بجھانے کے ہیں دعوے اس قدر
وہ محبت کا ہے دریا، لیکن اب دریا میں پانی ہے کہاں

ان دریچوں میں وہ صورت ہی نہیں ہے ڈھونڈتا ہوں مَیں جسے
خوش نما پوشاک میں ہر جسم بے جاں ہے، جوانی ہے کہاں

چاہنے والا مَیں جس کا تھا وہ میرا چاہنے والا گیا
نقشِ اوّل ہی نہیں تو کیا مَیں پوچھوں نقشِ ثانی ہے کہاں

آنے والی لہر سے مایوس تو ہرگز نہیں صابر ظفؔر
آنے والی لہر کی لیکن یہاں کوئی نشانی ہے کہاں

○

ہزار قتل گہوں سے گزر کے دیکھا ہے
کہیں بھی تُو نہ ملا، خود بھی مر کے دیکھا ہے

وہاں بھی خاک ہی اڑتی دکھائی دی ہے اسے
کبھی جو قیس نے اندر بھی گھر کے دیکھا ہے

مجھے سمیٹ کے میرے حوالے کر دے وہ
برائے خودکشی اکثر بکھر کے دیکھا ہے

پلٹ کے اس نے نہ سوئے فلک کبھی دیکھا
زمیں کی کوکھ میں جس نے اتر کے دیکھا ہے

تمام عمر رہا مَیں ظفرؔ اندھیرے میں
دکھائی کچھ نہ دیا عشق کر کے دیکھا ہے

○

اگر یہ نین کسی سے ہمارے لگ جاتے
تو ایسے غرق نہ ہوتے کنارے لگ جاتے

ہمارا عشق اگر کل جہان پر کُھلتا
دل ایک دوجے سے سارے کے سارے لگ جاتے

کسی ٹھکانے سے لگتی دلوں پہ چوٹ اگر
تو پھر ٹھکانے ترے غم کے مارے لگ جاتے

ہم ایک خاص کنارے کی چاہ میں ہوے غرق
لگاتے ورنہ جہاں بہتے دھارے، لگ جاتے

کھلی فضاؤں میں اڑنا ہمیں بھی راس آتا
اگر ہمیں بھی ظفرؔ پَر تمہارے لگ جاتے

○

اسی کی اوٹ میں دل میرا ہو رہا تھا نہال
ڈھلک رہی تھی جو شانوں سے اس کے، سرمئی شال

زمین بانٹنے والے زمین اوڑھ چکے
بچا ہے ان کے اثاثے میں بیلچہ نہ کدال

عجب نہیں کہ جلائیں کل اس کے پُتلے لوگ
جو آج رکھتا ہے بستی میں اپنا جاہ و جلال

میں اس کو دیکھ تو سکتا ہوں، ڈوب سکتا نہیں
چمکتے پانیوں جیسا ہے جو سنہری تھال

ظفرؔ ہیں ساحلوں جیسے ہی پانیوں کے عذاب
کبھی تو پوچھے گا احوال، مچھلیوں سے، جال

○

یوں نہ ہو، یہ چراغ جب گُل ہو
بزم برخاست ہو، بہت غُل ہو

ہم تو ہیں بس تمہارے ہونے سے
جزو بھی تم ہو اور تمہی کُل ہو

اس کنارے کے لوگ مل تو سکیں
کوئی کشتی ہو یا کوئی پُل ہو

پوچھا جائے اگر کہ ہو کوئی بات؟
ساری محفل کہے کہ بالکُل ہو

دل عجب طفل ہے کہ چاہے ظفرؔ
باغ ہو تتلیاں ہوں اور گُل ہو

O

اسی لیے نہیں کوئی ہوئی ہے حیرانی
بھنبھور سے تو زیادہ ہے دل کی ویرانی

مرے خدا، کوئی بادل تو بھیج، مَیں کب تک
تلاش کرتی رہوں گی سراب میں پانی

اب آ کہ ٹوٹنے والا ہے آس کا خرچہ
اب آ کہ ٹوٹنے والی ہے سانس کی تانی

میں تجھ سے کیسے کہوں لوٹ کر تُو کیچ نہ جا
میں تجھ سے کیسے کہوں 'رات رہ پؤ' اے جانی

میں یہ بھی جانتی ہوں، ہے فنا ہمارے لیے
میں یہ بھی جانتی ہوں، عشق تو نہیں فانی

O

خود بھی مَیں بسوں تجھے بساؤں
معبد کی جگہ مکاں بناؤں

یہ نور ظہور ہو رہے گا
آنکھوں کو تو بجھنے سے بچاؤں

جو خواب کو اصل سے ملا دے
میں اس سے کہیں بچھڑ نہ جاؤں

یہ بھی تو شکست خوردگی ہے
جاؤں اسے حالِ دل سناؤں

تُو اتنا عزیز ہے کہ تجھ کو
اب رسماً کیا گلے لگاؤں

O

میں قید اگر یہاں ہوں تو وہ بند ہیں وہاں
کُھلنا تو چاہتی ہیں مری سمت کھڑکیاں

کیسے کروں نہ ایسی رفاقت پہ جاں نثار
اتروں اگر تو ساتھ اترتی ہیں سیڑھیاں

دراصل ہے مری انہی چیزوں میں زندگی
دن رات مَیں گزارتا ہوں جن کے درمیاں

اتنا تپاکِ یار بھی حاصل نہیں رہا
جتنی زیادہ مجھ پہ کتابیں ہیں مہرباں

کاش اس طرح ظفرؔ کوئی رکھے مجھے عزیز
جیسے خیال رکھتی ہیں بارش میں چھتریاں

○

کہاں کوئی بدن کا بوجھ اتارے
سمندر کیا ہوے تیرے کنارے

یہ پانی اب مقدر ہو چکا ہے
مگر جو ساحلوں پر دن گزارے

یہاں تو دوسرا کوئی نہیں ہے
کوئی اپنے سوا کس کو پکارے

رواں ہیں آخرِ شب کے مسافر
مگر اب ڈوبتے جاتے ہیں تارے

ظفرؔ یہ بادباں ہی جانتا ہے
ہواؤں نے کیے ہیں کیا اشارے

O

کوئی عکس ہے کہ وہ آئنہ، کوئی خواب ہے کہ پری ہے وہ
ہوئے جس کو پا کے نہال تم، کہو کس کی جلوہ گری ہے وہ

طرب و ملال سے ماورا، کوئی معجزہ ہے جو دید کا
کہو کس کا حسن ہے حکمراں، کہو کس کی خوش نظری ہے وہ

کوئی عشق روح میں رچ گیا، درِ یار تک جو پہنچ گیا
کہو کس نے لَو وہ لگائی ہے، کہو کس نے آگ بھری ہے وہ

میں پڑا ہوں راہ میں اس طرح، کوئی خاک دھول ہو جس طرح
مجھے آنکھ بھر کے جو تک لیا، کہو کس کی دیدہ وری ہے وہ

کوئی ہم سخن ہے نہ ہم سفر، کوئی باخبر ہی نہیں ظفرؔ
جو پیام آتے ہیں غیب سے، کہو کس کی نامہ بری ہے وہ

O

تال کا پانی ٹھہرا ٹھہرا، گم صم سبھی ممولے
چلا گیا ہے جانے والا، گھاٹ پہ بیٹھ کے رولے

میں ہوں اور چھوڑے کا ہے، تازہ تازہ صدمہ
اور ہو گہرا صدمہ جس دم کالا تیتر بولے

کھیت اجاڑ کے تیرے تن کا، چلتا بنا ہے کوئی
پھر بھی نیند اگر آتی ہے، سرسوں اوڑھ کے سولے

بس کے اڈّے پر وہ ناری، آج اچانک دیکھی
سوکھ کے ہوگئی کانٹے جیسی، ہاتھ لگے تو ڈولے

کیسا برات کا شور شرابہ، کیا شادی کی رسمیں
ٹوٹ گئی ہے کانچ کی گڑیا، بکھر گئے ہیں پٹولے

○

یہ اور بات ترے روبرو نہیں گزرا
میں جس عذاب سے گزرا ہوں تُو نہیں گزرا

گزر رہا ہے کوئی اور اس خرابے سے
ہنوز قافلۂ رنگ و بو نہیں گزرا

میں اس بہار سے بھی نامراد لوٹ آیا
جہاں سے کوئی کبھی بے نمو نہیں گزرا

نہیں ہوں معرکہ آرا تو میرا دوش ہی کیا
کہ اس نواح سے میرا عدو نہیں گزرا

جما دیا مجھے یخ بستہ ساعتوں نے ظفرؔ
گلے سے سانس رگوں سے لہو نہیں گزرا

○

یہ بھی کیا زندگی ہماری ہے
تُو نہیں اور سانس جاری ہے

اک سواری رواں دواں ہے ابھی
یہ مگر آخری سواری ہے

کیا ملا ہم کو، یہ نہیں معلوم
واقعہ یہ ہے، جان ہاری ہے

کر رہے ہیں جہان سے پردہ
اب یہی اپنی پردہ داری ہے

دن بِتائے ہوئے بتائے ہیں
شب گزاری ہوئی گزاری ہے

O

میں سوچتا ہوں جسے، آشنا بھی ہوتا ہے
مگر خیال سے وہ ماورا بھی ہوتا ہے

سوائے شاعری زنداں میں کچھ کیا ہی نہیں
وگرنہ بندِ قفس کھولنا بھی ہوتا ہے

زیادہ تر مَیں عناصر سے دور دیکھوں اسے
وہ خاک و آتش و آب و ہوا بھی ہوتا ہے

اسی کے در کے فقط ہو کے رہ گئے ہیں ہم
سنا ہے جب سے کہ دروازہ وا بھی ہوتا ہے

ظؔفر وہاں کہ جہاں ہو کوئی بھی حدِ کمال
فقط بشر نہیں ہوتا، خدا بھی ہوتا ہے

O

آب میں ہم رہے تو یوں، آب پرست ہو گئے
خُشکیاں آ گئیں جہاں، خود کو وہیں ڈبو گئے

میرا نصیب تھا کہ مَیں، آبلہ پا گزر گیا
اپنی طرف سے آپ تو، راہ میں خار بو گئے

آج نجانے کس لیے، رونقِ شب سے بے نیاز
دل زدگانِ شہر بھی، شام سے پہلے سو گئے

ربطِ کہن کے پاسدار، ہم رہے تیرے غمگسار
یعنی کبھی تری طرف، آئے تو کُھل کے رو گئے

ٹھوکریں اب لگیں ہمیں، پائیں جو راہِ راست بھی
یوں ہوئی گم رہی نصیب، ہوش و حواس کھو گئے

O

کھڑکیاں جو کھلی رہیں شب بھر
گھر کی باتیں چلی گئیں باہر

کم کم ایسی وفا نظر آئی
اپنی جا سے ہٹا نہیں پتھر

اڑنے لگتی ہے ریت آنکھوں میں
چھین لیتا ہے جب کوئی چادر

جب بھی مومن کوئی بھٹکتا ہے
دھیان جاتا ہے جانبِ منبر

آ رہے ہیں ظفرؔ کنارے یاد
کشتیاں ڈوبیں، گم ہوئے لشکر

○

وہی ستارہ دوبارہ ادھر سے گزرا تھا
اور ایک پل سے نہیں عمر بھر سے گزرا تھا

ستارہ پوری چمک سے مجھے ملا ہی نہیں
وہ ٹوٹتا ہوا میرے نگر سے گزرا تھا

ستارے جیسی چمک کب تھی اس کے چہرے پر
گزرنے والا یونہی بس نظر سے گزرا تھا

نہیں تھی مجھ کو اجازت ستارے چھونے کی
سو میں فلک سے نہیں بحر و بر سے گزرا تھا

ستارہ روندتا گزرا تھا میرے دل کو ظفرؔ
اگرچہ دیکھنے کو رہ گزر سے گزرا تھا

○

ملتا رہا پانیوں میں پانی
بنتی رہی اک نئی کہانی

ہم دونوں کہاں ہیں، دیکھ لیں سب
اک شمع تو چاہیے جلانی

جو بات مَیں کہہ نہیں سکا تھا
وہ بات بھی میری، اس نے مانی

تصویر کو بولنا سکھاؤں
کچھ تو مری ہووے ترجمانی

سانسوں کی بساط الٹ رہی تھی
جب تھا امکانِ کامرانی

○

خاک میں کیا ہے، نہ ہو تُو جو وہاں آسودہ
تیرے ہونے کے تصوّر سے ہے جاں آسودہ

ماورا ذات سے ہو کر یہ دعا مانگتا ہوں
ایک مَیں ہی نہیں، سارا ہو جہاں آسودہ

تجھ سے معنی ہیں، جنھیں پا کے ہیں آسودہ نفوس
اس کا مطلب ہے سخن کی ہے زباں آسودہ

ایسے آثار بھی کافی ہیں عدم سے ظاہر
جنھیں کرتے ہیں محبت کے نشاں آسودہ

کبھی پابند نہ رکھّا کسی محتاج کا حُسن
چاہے آسودہ عیاں ہو کہ نہاں آسودہ

○

غزال اک نئی وحشت سے اس طرف آیا
سو مَیں بھی عشق کی طاقت سے اس طرف آیا

قبیلے والے مجھے قتل کرتے، ممکن تھا
میں اپنے دل کی بغاوت سے اس طرف آیا

گھرا ہوا تھا بہت سرد مہر لوگوں میں
میں اپنے خوں کی حرارت سے اس طرف آیا

ملے جہاں بھی محبت، ادھر ہی جاؤں مَیں
سو ملنے اہلِ محبت سے اس طرف آیا

مری طرح جو کوئی آئے اس طرف تو کھلے
ظفرؔ مَیں کتنی مصیبت سے اس طرف آیا

O

چلو تو ساتھ چلو ورنہ ہم گئے تو گئے
کہ ایک بار جو سوئے عدم گئے تو گئے

جو سانس کھینچتے ہیں کوئی دم کے مہماں ہیں
کہ اب رکیں گے نہیں، کوئی دم گئے تو گئے

خدا کا ملنا نہ ملنا خدا کی مرضی ہے
مگر ہمیں ہے یہ دھڑکا صنم گئے تو گئے

یہی دلوں کا اثاثہ ہیں وقتِ رخصتِ یار
انہیں قریب ہی رکھو، یہ غم گئے تو گئے

یہی ہے عشق کہ بے خوفِ مرگ و زیست غزال
تمہاری سمت بصد رقص و کرم گئے تو گئے

○

چھوڑ کے میرا بحرِ دل، جانبِ آبِ زر گئے
آپ کی اپنی موج تھی، آپ جہاں اتر گئے

صبح تھی اور سکون تھا، شام ہے اور سکون ہے
وہ جو سفیرِ درد تھے، آج کہاں ٹھہر گئے

کون کسی کے واسطے، خوار ہوا تمام شب
تم بھی تو اپنے گھر گئے، ہم بھی تو اپنے گھر گئے

ہم بھی بہت تھے تیز پا، ان کو یہی بُرا لگا
راہ میں اس لیے ہمیں، روند کے راہ بر گئے

سانپوں کے سامنے ظفرؔ، جلتے نہیں دیے کبھی
آپ ابھی ادھر ہی تھے، آپ ابھی کدھر گئے

○

یہ تو وہ صورت نہیں، یہ تو وہ سیرت نہیں
یہ تو کوئی سینہ چاک کرنے کی حالت نہیں

عام سے یہ لوگ ہیں، عام سے یہ روگ ہیں
اپنی طرف کھینچ لیں، ان میں یہ طاقت نہیں

وہ ہی کریں رابطہ، روکیں وہی راستہ
جن سے نہیں واسطہ، جن سے کہ نسبت نہیں

کوئی نہیں ہے سجن، کوئی نہیں ہے لگن
کوئی نہیں ہے اگن، کوئی حرارت نہیں

کوئی نہیں دل نشیں، جھکتی نہیں یہ جبیں
میں تو کسی کا نہیں، یہ بھی حقیقت نہیں

○

وجود کیا ہے عدم کیا ہے کچھ نہ تھا معلوم
میں روبرو تھا کسی کے، تھا کون، کیا معلوم

تکون سی ہے، خدا، کائنات اور بشر
مگر مجھے تو ہو گردش میں دائرہ معلوم

ازل سے پہلے بھی تُو تھا اگر تو مَیں بھی تھا
کہ تُو تو مجھ ہی کو پہلے پہل ہوا معلوم

وہ عشق لے گیا بے داغ آگہی کی طرف
اور ابتدا میں ہوئی خوب انتہا معلوم

ظفؔر ہو یا کہ ہو رومؔی کہ شمسؔ تبریزی
سبھی کو ایک گلستاں ہے عشق کا معلوم

○

بکھری ہوئی کوئی کتاب، ڈھونڈ رہی تھی جلد ساز
میں نے وفورِ عشق سے، دستِ وفا کیا دراز

کھوجتا گم شدہ نوا، مَیں ہی بھٹک رہا نہ تھا
شورِ جہاں میں کوئی نَے، ڈھونڈ رہی تھی نَے نواز

اب یہ کُھلا کہ زندگی، میرے لیے نہیں رہی
گھر کی ہر ایک چیز ہی، مجھ سے ہوئی ہے بے نیاز

اپنے لبوں کو کھولنا، کارِ عبث ہے بولنا
بھول گئے مجھے سخن، بھول گئی مجھے بیاض

حاصل انہیں دوام ہے، ان کو ظفرؔ سلام ہے
جن کے علم میں سر بلند، جو بھی جواں ہیں سر فراز

O

وہ جس میں ناچ سکے زندگی کی رقاصہ
کوئی مکاں ہو مگر دین سا نہ دنیا سا

یہ سرزمین ہے بے نشہّ ساعتوں کی اسیر
لگاؤ دم کہ نہیں کوئی دم کا بھروا سا

وہ میرے ساتھ ہے میری ضرورتوں کی طرح
کسی فقیر کے پہلو میں جس طرح کاسہ

شراب و آب کی بارش ہوئی نجانے کہاں
کہ میری روح بھی پیاسی ہے جسم بھی پیاسا

دلیل یہ تو ظفر انتہائے وصل کی ہے
تھکن سے چُور بدن میں بخار ہلکا سا

○

ستارے رات جو چادر سی اک بچھاتے ہیں
یہ جانتے ہیں کہ تھل میں فقیر آتے ہیں

میں ان میں، یار پنھل! دیکھتی ہوں مکھ اپنا
اگر سراب مجھے آئنہ دکھاتے ہیں

دراڑ ڈالتے ہیں کیدو دو دلوں میں مگر
محبتوں کو امر رانجھڑے بناتے ہیں

میں جاگتی ہوں تو کیا دیکھتی ہوں، گم ہے پنھل
بلوتے چھاچھ جو مٹکے صدا لگاتے ہیں

مرے لیے ہیں یہ سب زیورات، زنجیریں
عمر! مجھے تو مرے لوگ یاد آتے ہیں

O

پختگیِ خیال اب، صورتِ خواب ہو گئی
فکر کا ذکر کیا کریں، فکر خراب ہو گئی

کیسے ہمارے درمیاں، باخبری بحال ہو
وصل کی جو بھی راہ تھی، ہجر کا باب ہو گئی

ایک نگاہِ خود شناس، مجھ سے ہوئی جو روشناس
اپنے ہر اک سوال کا، خود ہی جواب ہو گئی

حد سے گزر گئے جو دن، شامِ عمل میں ڈھل گئے
شامِ عمل جو ڈھل گئی، یومِ حساب ہو گئی

لکھتا رہے گا کب تلک، خوبیِ حسنِ یار تو
اب تو اسے دکھا ظفرؔ، اب تو کتاب ہو گئی

○

دکھا کے اپنے حسن کی ادا، عجب عجب طرح
وہ رات مجھ پہ مہرباں ہوا، عجب عجب طرح

برہنگی میں جسم پر تھی اک قبائے تیرگی
قبا کا بند بند پھر کُھلا، عجب عجب طرح

مری ضرورت ایک سے زیادہ محفلیں رہیں
سو میں نے پُر کیا تھا اک خلا، عجب عجب طرح

نہیں تھا یاد رنگ وصل کا، بس اتنا یاد ہے
چمک رہی تھی ہاتھ پر حنا، عجب عجب طرح

وہ رنگ رنگ تتلیاں مجھے بہت پسند تھیں
ہُوا میں ان کے عشق میں فنا، عجب عجب طرح

O

ہمیشہ حلقۂ نامہرباں میں رہتے ہیں
جو حق پہ ہوتے ہیں وہ امتحاں میں رہتے ہیں

حسد کی آگ سے کس کس کا گھر جلاؤ گے
کہ اہلِ عشق تو سارے جہاں میں رہتے ہیں

مرے خیال میں دفنا چکی ہے جن کو زمیں
کب آئیں گے وہ اگر آسماں میں رہتے ہیں

نثار ہیں جو محمد ﷺ پہ، ہم ہیں ان پہ نثار
نجانے آپ ابھی کس گماں میں رہتے ہیں

خدا کی راہ میں جاں وار دیں جو لوگ ظفرؔ
وہ زندگی کی طرح جسم و جاں میں رہتے ہیں

○

ہوئے غرق عشق میں سسیئے، یہ ترے بھنبھور کے سلسلے
مری پور پور سے آ ملے، تری پور پور کے سلسلے

یہ جو ہاؤ ہو ہے جہان میں، نہ سمائے کیوں یہ گمان میں
تری دلبری کی صدا بھی ہے، نہیں صرف شور کے سلسلے

یہ جو رنج وغم کی ہیں آندھیاں، یہ ہیں آندھیاں تری باندیاں
رکھیں من پتنگ کو کھینچ کر، یہ لگن کی ڈور کے سلسلے

نہیں پھر بھی کہہ سکا الوداع، ہوے گرچہ بارہا منقطع
کبھی تیری اور کے سلسلے، کبھی میری اور کے سلسلے

کوئی اک نگاہ میں لے اڑا، جو اثاثہ خانۂ دل میں تھا
ظفرؔ ان دنوں ہیں بہت دراز، کسی من کے چور کے سلسلے

○

تجھ سے جو محوِ گفتگو ہیں
وہ لوگ غزل کی آبرو ہیں

کیوں اور کسی کے دل میں ٹھہریں
ہم صرف تمہاری آرزو ہیں

آؤ تمہیں برگ و بار بخشیں
ہم لوگ ہی باعثِ نمو ہیں

متروک الفاظ کی طرح ہم
لگتا ہے، کبھو نہیں، کبھو ہیں

بے رنگ ہیں ہم تری نظر میں
حالانکہ ظفرؔ لہو لہو ہیں

○

یادوں کی سیڑھیوں پہ جمے ہیں ابھی قدم
ملتے رہا کرو کہ بھلا دیں تمھیں نہ ہم

ملبے سے دل نکل نہ سکا تھا کسی طرح
اس طرح خشت خشت گری تھی فصیلِ غم

چاہیں بہت کہ چُومیں گلوبند کا عقیق
جنبش کہاں ہے ہونٹوں میں، سانسوں میں کب ہے دم

جن پر تھا اعتبار کہ لکھّیں گے حرفِ حق
توڑے گئے وہ ہاتھ، وہ چھینے گئے قلم

ہوتی گئی بلند ہی آوازِ حق ظفؔر
روکے گئے جلوس، گرائے گئے علم

O

کیا ہوا جو تم نکلے، حلقۂ محبت سے
پیڑ سوکھتے کب ہیں، طائروں کی ہجرت سے

یہ عجیب عادت ہے، جو بھی حاصلِ جاں ہے
اس سے دور بھی رہنا، دیکھنا بھی حسرت سے

اے خدا سلامت رکھ، پھول جیسے بچّوں کو
سردیوں کی شدت سے، گرمیوں کی حدت سے

میں ستارۂ شب ہوں، صبحِ نو کا طالب ہوں
اب اگر اجازت دو، پھر ملوں گا فرصت سے

○

اسے یقیں ہے کہ زندان ٹوٹ سکتا ہے
پرندہ قید میں یوں ہی نہیں چہکتا ہے

وہ یاد آتا ہے، آتا ہے ہر طرح سے قرار
بہار آتی ہے، سارا چمن مہکتا ہے

بجھائے پیاس نہ کس طرح مجھ سا تیرہ نصیب
وہ روشنی کا پیالہ ہے اور چھلکتا ہے

میں چاہتا ہوں کسی آگ میں مِلا دوں یہ آگ
مرے وجود میں شعلہ کوئی بھڑکتا ہے

کوئی رمق ہی نہیں زندگی کی اس میں ظفرؔ
سوائے اس کے کہ پہلو میں دل دھڑکتا ہے

O

انہی ستاروں سے انبر مرے، چمکتے ہیں
جو عرش پر نہیں، اندر مرے، چمکتے ہیں

انہی ستاروں کی صورت کہ جن کو بجھنا نہیں
مرے کلام میں اکثر مرے، چمکتے ہیں

انہی ستاروں کو لے آؤں اپنی موجوں میں
کہ جن کے واسطے ساگر مرے، چمکتے ہیں

انہی ستاروں کی ہے روشنی عزیز مجھے
کہ جن کے ہونے سے منظر مرے، چمکتے ہیں

انہی ستاروں میں اُس نور کو ترستا ہوں
ظفرؔ قریب جو آ کر مرے، چمکتے ہیں

○

راہوں کی دلکشی کا اثر بھول جائے گا
اگلے سفر میں یہ بھی سفر بھول جائے گا

کچھ اور دن اگر یونہی بیگانگی رہی
دستک جو دینے آؤ گے، در بھول جائے گا

ممکن نہیں کہ یاد رکھے عمر بھر ہمیں
آخر ہے وہ بھی ایک بشر، بھول جائے گا

ہم ہوں گے اور پھر وہی تنہائیاں ظفؔر
اس سے بچھڑ کے اپنا بھی گھر بھول جائے گا

O

کئی باغ کب کے تھے سو چکے، جو نئی رتوں نے جگا دیے
یہ شہادتوں کی بہار ہے کہ جو اتنے پھول کھلا دیے

کہاں کھو گیا ہے نجانے تُو کہ پکارتا ہے مرا لہو
وہ زمانے پھر نہیں آئیں گے جو خموش رہ کے بِتا دیے

نئی ضرب ہے نیا حوصلہ، نیا کرب ہے نیا ولولہ
جو دیے بجھے وہ جلا دیے، جو علم گرے وہ اٹھا دیے

کبھی فاصلوں کو سمیٹ کر، کبھی آنسوؤں کو سمیٹ کر
جو اجڑ گئے وہ بسا دیے، جو بچھڑ گئے وہ ملا دیے

یہی زندگی ہے یہی ہنر کہ یہ نغمہ ہائے وفا ظفرؔ
کبھی دوستوں کو سنا دیے، کبھی دشمنوں کو سنا دیے

○

میں اچھا یا بُرا رہوں گا
تیرا ہی مبتلا رہوں گا

یا چھُولوں گا ترے قدم مَیں
یا مثلِ نقشِ پا رہوں گا

ڈرتا ہوں مَیں کہاں اجل سے
اب تجھ سے دور کیا رہوں گا

آؤ مت یاد، آپ آؤ
ورنہ مَیں بھولتا رہوں گا

میں تیری فجر کا ستارہ
سجدے میں جاگتا رہوں گا

○

بوس و کنار ہی سے فروزاں ہے کائنات
جیسے ہر ایک ذات میں ہو محوِ عینِ ذات

ہر پل طوافِ شوق ہو، ہر پل ہو بندگی
سانسوں کے آنے جانے کو سمجھوں نہ مَیں حیات

گاتے ہیں اس کے نام کا نغمہ وہ ہر گھڑی
دن، ڈھونڈتا ہے سُر تو ملاتی ہے تال، رات

اس واسطے بھی ہونٹ ہلانے پہ ناز ہے
ہر بول اس کا بول ہے ہر بات اس کی بات

ہونے کے واسطے نہ تردّد کرو ظفرؔ
درکار ہے مجھے کوئی بے ساختہ ثبات

O

سکت نہیں تو کسی کا مقابلہ مت کر
یہ دشمنوں کا نگر ہے یہاں سے ہجرت کر

ہر اک کی بات کو سن اور طفلِ مکتب رہ
بزرگ بن کے نہ ہر شخص کو نصیحت کر

جو ہو سکے تو کوئی انقلاب لا، ورنہ
ہر اک اصول، ہر اک فلسفے سے نفرت کر

جہانِ مکّر میں محتاط رہ ذرا، صاؔبر
ہر آدمی کو پرکھ اور پھر محبت کر

O

اگر روزِ اجل کوئی نہیں ہے
تو کیوں جینے کا پل کوئی نہیں ہے

ہم اہلِ غم کی ہستی میں بجز مرگ
کسی اُلجھن کا حل کوئی نہیں ہے

ہیں اشکوں سے بھری آنکھوں کی جھیلیں
مگر ان میں کنول کوئی نہیں ہے

بچھڑتی جا رہی ہے زندگانی
اگرچہ بے عمل کوئی نہیں ہے

میں اپنے روگ لکھتا جا رہا ہوں
مرا رنگِ غزل کوئی نہیں ہے

○

کبھی کبھی وہ ہماری طرف بھی دیکھتے ہیں
سو یہ کھلا کہ وہ اپنا ہدف بھی دیکھتے ہیں

اک آدھ بار جو بھجوا چکے ہیں تحفۂ گل
ہم آج کل انہیں خنجر بکف بھی دیکھتے ہیں

جو ریگ زار کو تکتے ہیں تہہ بہ تہہ وہ لوگ
اگر سراب میں اتریں صدف بھی دیکھتے ہیں

نشاطِ دہر پہ رکھتے ہیں طائرانہ نگاہ
جہاں ہو مجمعِ غم، صف بہ صف بھی دیکھتے ہیں

چلی ہے جن کے قدم چومنے کی رسم، ظفرؔ
ہم ان کا درجۂ عزّ و شرف بھی دیکھتے ہیں

○

یہی نہیں کہ ہوا کی عجیب سمفنی تھی
کسی کے لب پہ دعا کی عجیب سمفنی تھی

میں رات رقص کناں تھا اسی کے نشّے میں
کسی کی جنبشِ پا کی عجیب سمفنی تھی

میں اپنے یار کے پہلو سے اٹھ نہ پایا تھا
اگرچہ کوہِ ندا کی عجیب سمفنی تھی

پہاڑ سنتے رہے اور درود پڑھتے رہے
کہ شاہِ غارِ حرا کی عجیب سمفنی تھی

میں سن رہا تھا تلاوت جن آیتوں کی ظفرؔ
ان آیتوں میں خدا کی عجیب سمفنی تھی

○

پل دو پل کی چاہت میں
زرد ہوئی مَیں رنگت میں

ڈھونڈ رہی ہوں جوانی کو
پچھلی رات کی صحبت میں

اپنے آپ کو پہچانا
میں نے تیری قربت میں

کتنے تار ہمارے ہیں
اس دستارِ فضیلت میں

کیا جانے کب آئیں ظفرؔ
اچھّے لوگ حکومت میں

O

قلندروں کے مزاروں پہ مست حال پرندے
جب آئیں ہوش میں، دیکھیں مری دھمال پرندے

وہ جائیں ڈار میں اپنی، اڑیں بہار میں اپنی
جو تیرے ہاتھ میں ہیں وہ ذرا اچھال پرندے

ادھر اب آئیں تو کیسے، اور آ کے گائیں تو کیسے
کہ دیکھتے ہیں ترے گلشنوں میں جال پرندے

گل و ثمر ہی رہے ہیں، نہ وہ شجر ہی رہے ہیں
دکھائی دیتے ہیں باغوں میں خال خال پرندے

یہ عید پھر نہیں ہوگی یہ دید پھر نہیں ہوگی
خوشی کا دن ہے قفس سے ظفرؔ نکال پرندے

○

وصولِ دل کے عوض کیا کریں گے دیوانے
تجھے خرید لیا دل فریب دنیا نے

وصال کیا ہے طرب کیا ہے زندگی کیا ہے
جو تُو نہیں تو ہیں باطل یہ سارے افسانے

غمِ اجل نے بھلایا فراقِ یار کا غم
سو آشنا ہے اجل اور سب ہیں بیگانے

بکھر رہا تھا تو سب نے مجھے بکھرنے دیا
سمیٹنے کوئی آیا مجھے، نہ سمجھانے

یہ بات جاننے والا ہی جانتا ہے ظفرؔ
میں بولتا ہوں تو لگتے ہیں لوگ دہرانے

O

ان کے بغیر مجھ کو ادھوری لگے حیات
پتے اڑیں تو مَیں بھی اڑوں ان کے ساتھ ساتھ

حرفِ وصال لکھتے ہوئے رک گیا تھا وہ
چاہا ہو جیسے تھامنا، کاغذ نے اس کا ہاتھ

بکھری ہوئی ہیں گھر میں جو چیزیں ادھر ادھر
ان میں سما گئیں مرے غم کی سبھی صفات

کمرے سے مَیں نے اس کو ہٹایا نہ تھا کبھی
محسوس کر رہا تھا جو بستر، سہاگ رات

رنگِ خرام و طرزِ قیام اس کا، پوچھتا
مجھ سے اگر ظفرؔ، در و دیوار کرتے بات

○

درد کے ساز کی لَے اور بڑھا جائے گا
جو بھی آئے گا کوئی تار ہلا جائے گا

دیکھ لو کوچۂ دلدار کو چلتے چلتے
بیٹھ جاؤ گے تو مشکل سے اٹھا جائے گا

اس کے دو بول محبت کے غنیمت جانو
وہ جو چپ ہوگا تو پھر سب کو رلا جائے گا

وہ تو اک پل ہے اسے ایک ہی پل رکنا ہے
بات کر لیجیے، پھر وہ بھی چلا جائے گا

خاک ہو جائے گی دنیائے زر و سیم، ظفرؔ
میں تو مٹی کا مکیں ہوں مرا کیا جائے گا

○

وہ کیوں نہ روٹھتا، مَیں نے بھی تو خطا کی تھی
بہت خیال رکھا تھا بہت وفا کی تھی

سنا ہے ان دنوں ہم رنگ ہیں بہار اور آگ
یہ آگ پھول ہو، مَیں نے بہت دعا کی تھی

نہیں تھا قرب میں بھی کچھ مگر یہ دل، مرا دل
مجھے نہ چھوڑ، بہت مَیں نے التجا کی تھی

سفر میں کشمکشِ مرگ و زیست کے دوران
نجانے کس نے مجھے زندگی عطا کی تھی

یہ ابتدا تھی کہ مَیں نے اسے پکارا تھا
وہ آگیا تھا ظفرؔ اس نے انتہا کی تھی

O

مجھے عشق، مست توکّلی، ترے عشق سا نہیں چاہیے
کسی دوسرے کے سہاگ میں، کبھی جھانکنا نہیں چاہیے

تری بے خودی بھی فریب ہے، تری عاشقی بھی فریب ہے
کسی ڈولتے ہوے جسم کو، ترا آسرا نہیں چاہیے

ہیں عجیب عشق کی منزلیں کہ جو ہر کسی کو نہیں ملیں
جہاں ایک ہو کوئی ہم سفر، وہاں دوسرا نہیں چاہیے

ہیں عجیب دل کے معاملے، کبھی قربتیں کبھی فاصلے
جہاں دو دلوں میں ہوں رغبتیں، وہاں تیسرا نہیں چاہیے

کوئی سمّوں جیسی نہیں ملی، وہ کلی دوبارہ نہیں کھلی
کسی اور کی ہو جو زندگی، اسے ڈھونڈنا نہیں چاہیے

○

میں بھی ہوں اک مکان کی حد میں
یعنی زندہ ہوں اپنے مرقد میں

دم بخود زندگی بسر کر جاؤ
گونج کر کیا کرو گے گنبد میں

جی بہت چاہتا ہے ملنے کو
آپ رہتے نہیں کسی حد میں

آپ کے بے شمار کھاتے ہیں
ڈال دیجے ہمیں کسی مد میں

فالنامہ ہے زندگی بھی ظفرؔ
جی رہا ہوں حروفِ ابجد میں

O

میں ٹوٹ پھوٹ گیا ہوں اب اپنے اندر پھر
کہ مار دی ہے مجھے زندگی نے ٹھوکر پھر

اچانک اس نے بچھڑ کے دلا دیا احساس
کہ سو گیا ہے اچانک مرا مقدر پھر

وہ اٹھ گیا ہے تو دنیا سے اٹھ گیا ہے کیا
کہ آ کے بیٹھے نہ شاید مرے برابر پھر

نگلنا چاہتا ہے میرے آخری احباب
بپھر رہا ہے مرے سامنے سمندر پھر

یہ میں نے دیکھا کہ اس طرح دیکھا اُس نے ظفرؔ
کہ جیسے دیکھے گا مجھ کو نہ وہ پلٹ کر پھر

○

دھوپ میں بادل روکتا ہے یا پیڑ کوئی ٹھہراتا ہے
آدمی منزل کی خواہش میں، رستے میں رہ جاتا ہے

میری خاطر ریت پہ کوئی ایڑیاں رگڑے اور اک سمت
جلتے صحرا کے دامن میں، دریا سوکھتا جاتا ہے

آتی جاتی گاڑیاں دیکھے، اپنے مکاں کی چھت سے کوئی
میں بھی ہاتھ ہلاتا ہوں جب کوئی ہاتھ ہلاتا ہے

جانے والا رکتا کب ہے، پیہم دیکھتے رہنے سے
آنکھیں ساتھ چلی جاتی ہیں، جسم وہیں رہ جاتا ہے

اس دیہاتی کی صورت ہے، ترکِ عشق پہ حال ظفرؔ
جو گاڑی کے چھوٹنے پر بھی، پیچھے بھاگتا جاتا ہے

○

شجر وہ چھوڑ آیا، آشیانہ چھوڑ آیا مَیں
پلٹ کر دیکھتا ہوں، کیا ٹھکانہ چھوڑ آیا مَیں

سفر دھندلا دیا گرد و غبارِ اہلِ دنیا نے
مگر شفّاف کیسا وہ گھرانہ چھوڑ آیا مَیں

جو اپنے رنگ کے امکان سے باہر نظر آئیں
وہ تصویریں برنگِ شاعرانہ چھوڑ آیا مَیں

لیے پھرتا ہوں اب تو موت کے اسباب ہی سارے
بہت پیچھے حیاتِ جاودانہ چھوڑ آیا مَیں

ظفرؔ زنداں میں زنجیریں چھنکتی ہیں وہی اب تو
جنھیں خود ہی بہ حالِ دلبرانہ چھوڑ آیا مَیں

○

جو بات دل میں ہے، لب پر اسے نہ لاؤں کیوں
خموش رہ کے ترے غم میں گھلتا جاؤں کیوں

کوئی کھڑا ہے مرے روبرو تو مجھ کو کیا
میں بے طلب کسی جانب نظر اٹھاؤں کیوں

جو میرا خواب نہیں کس لیے اسے دیکھوں
جو بوجھ مجھ پہ نہیں میں اسے اٹھاؤں کیوں

اگر وہ میرا ہے خود میری سمت آئے گا
میں دوسروں کی طرح اس کی سمت جاؤں کیوں

O

مہرباں جب ترا خیال ہوا
سانس پوری طرح بحال ہوا

میں نے دیکھا نہ پھر کسی کی طرف
ایک عشق ایسا حسبِ حال ہوا

پھول کھلتے چلے گئے سرِ دشت
رام جب جب کوئی غزال ہوا

جان ابھی تک نہ کر سکا تری نذر
سوچ کر یہ بہت ملال ہوا

کس کے آگے جواب دہ ہو ظفرؔ
کیا کہو گے اگر سوال ہوا

○

سرِ دست تو تہی دست ہی تری سمت ہم چلے آئے ہیں
کہ بہت ہی بے ہنری رہی سو بچشمِ نم چلے آئے ہیں

یہ کرم ترا یہ عنایتیں کہ بدل رہی ہیں روایتیں
جنھیں ہوش تھا نہ خود اپنا بھی وہ سرِ حرم چلے آئے ہیں

رہِ ممکنات پہ جانے دے، ذرا پل صراط پہ جانے دے
سرِ حشر پڑھتے ہوئے درود، ترے خوش قدم چلے آئے ہیں

ہے علاقہ اپنا تو صبر سے، نہیں واسطہ کوئی جبر سے
ترے غم سے ہم تو ہیں آشنا، یہ کہاں کے غم چلے آئے ہیں

ملا حکم تیری نگاہ کا، جو بنا وسیلہ پناہ کا
نہ تھی ہم میں کوئی سکت ظفرؔ، مگر ایک دم چلے آئے ہیں

○

یہ جو تری خوش بیانیاں ہیں
دہرائی ہوئی کہانیاں ہیں

گمراہ کریں گی اور تجھ کو
منزل کی جو یہ نشانیاں ہیں

پانی تو گزر چکا ہے کب کا
اب ریت کی بس روانیاں ہیں

اب خواہشیں بانجھ ہو چکیں سب
کہنے کو ہماری رانیاں ہیں

سچ یہ ہے، ظفرؔ ہے صرف تیرا
باقی سب بدگمانیاں ہیں

○

ادھر ادھر سے چنوں کوئی حرف اور نہ خیال
کھلے جو تُو، کُھلیں آکاش دھرتی اور پاتال

اگر تُو چاہے تو صندل میں پھول کھلنے لگیں
مگر بہار کو درکار صرف تیرا وصال

تجھے تلاش کروں گا تو پھر ملے گا جواب
ہر ایک سمت سوال اور ہر ایک انت سوال

میں سوچتا ہی نہیں ہوں کسی کے بارے میں
میں ڈھونڈتا ہی نہیں ہوں جہاں میں تیری مثال

میں دیکھتا ہوں تو خیرِ کثیر دیکھتا ہوں
کہ میرے حال پہ چھایا ہوا ہے تیرا حال

O

یہاں جو پیڑ تھے اپنی جڑوں کو چھوڑ چکے
قدم جماتی ہوئی سب رتوں کو چھوڑ چکے

کوئی تصورِ زنداں بھی اب نہیں باقی
ہم اس زمانے کے سب دوستوں کو چھوڑ چکے

نکل چکے ہیں ترے روز و شب سے اب آگے
دنوں کو چھوڑ چکے ہم شبوں کو چھوڑ چکے

جو مر گئے وہی زندان سے نکالے گئے
نہیں کہ اہلِ قفس قیدیوں کو چھوڑ چکے

اگرچہ ایسا نہیں، لگ رہا ہے ایسا مگر
کہ راہی سارے ظفؔر رہروں کو چھوڑ چکے

○

تمہارے ہوتے ہوئے بھی ہوں مَیں خسارے میں
کہ بہہ گئے ہیں مرے لوگ بہتے دھارے میں

نہیں کہ وہ نظر آتا نہیں کسی جانب
میں دیکھتا ہوں اسے موت کے نظارے میں

بلا سے اس کی، کوئی ڈوبے یا کوئی ابھرے
وہ ماہی خور جو غلطاں ہے آب پارے میں

چکور، چاند کی چاہت میں صرف ہے پاگل
کوئی کشش نہیں اس کے لیے ستارے میں

گوارا کر لیا کنجِ قفس ہی میں رہنا
مگر نہ کچھ کہا، بلبل نے گل کے بارے میں

O

گم ہے شہزادیٔ شب اور پری ہے خاموش
بجھ گیا دل کہ چراغِ سحری ہے خاموش

میری خاموش محبت ہی مری منزل ہے
آنکھوں آنکھوں میں کوئی نامہ بری ہے خاموش

سب کو جاتے ہوئے دیکھا ہے اجل کی جانب
لٹا اسباب مگر ہر سفری ہے خاموش

ایک وہ ہیں کہ جو ہجرت ہی کا رونا روئیں
ایک مَیں ہوں کہ مری دربدری ہے خاموش

اس قدر ظلم ہوا میرے علاقے میں ظفؔر
جیسے بزدل ہوا چپ، ویسے جری ہے خاموش

O

ہوا میں خاک سہی، خاک میں ہوا تو نہیں
دیا جو خاک میں رکھا ہے وہ بجھا تو نہیں

رہو گے کیا یونہی حیرت سرائے خاک میں چپ
میں سن رہا ہوں کہو تم نے کچھ کہا تو نہیں

میں دیکھتا ہوں گزرتے ہوئے مسافر کو
مسافروں کا اگرچہ یہ راستا تو نہیں

کوئی مرے کہ جیے، شاعری کیے جاؤں
یہ شاعری کہیں میرے لیے سزا تو نہیں

O

ہزار مرتبہ اس نام سے پکارا اسے
قریب لا نہ سکا مَیں کبھی دوبارہ اسے

چلا گیا ہے اچانک حجاب میں وہ شخص
ہزار حیف کہ مَیں تک سکا نہ سارا اسے

وہ بات کرتا تھا اور کائنات سنتی تھی
ملا ہوا تھا کوئی غیب کا اشارہ اسے

جو تپ رہے تھے انہیں چھاؤں دینا چاہتا تھا
سلگتے تھل میں برس ہو گئے اٹھارہ اسے

ضرور کوئی نگہباں تھا اہل دل کا ظفر
وہ جاگتا رہا، تکتا رہا ستارہ اسے

○

یہ زیست یوں تو شب و روز کی غلام نہ ہو
ہمارا دن نہ چڑھے اور کسی کی شام نہ ہو

ہر اجڑے شہر سے سہما ہُوا گزرتا ہوں
یہ خوف ہے کوئی دیوار ہم کلام نہ ہو

ہوائے شہرِ وفا مہرباں نہیں اتنی
کہ رتجگا بھی کریں نیند بھی حرام نہ ہو

خدا کرے وہی پہچان ہو ہماری ظفؔر
وہ ایک شعر کہ جس پر ہمارا نام نہ ہو

○

بھگونا چاہتی تھیں بارشیں، سو ہم بھیگے
نہ چھتریوں نے دیا ساتھ اور نہ آنچلوں نے

میں چھت پہ جاتا ہوں کب اور کب پلٹتا ہوں
مجھے نگاہ میں رکھنے لگے ہیں وہ زینے

مکاں کا آخری کمرہ تھا منتظر میرا
مرے لیے سبھی کھلتے چلے گئے کنڈے

یہ تشنگی ہے محبت کی انتہا جیسی
چھلک رہا ہے پیالہ کہ پیاسا دیکھے مجھے

میں باندھتا ہی چلا جا رہا تھا خود کو ظفرؔ
دراز ہوتے چلے جا رہے تھے وہ رسّے

○

غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی مانند
بچھڑ کے اس نے طبیعت اداس کر دی ہے

قدم اٹھاؤں تو میرے قدم نہیں اٹھتے
یہ کیسی تُو نے مجھے مہلتِ سفر دی ہے

وہ عمر جس میں ہمیں خود سے ملنا جلنا تھا
وہ عمر صَرف تری جستجو میں کر دی ہے

لہو رلا بھی گئی ہے وہ دل کی کیفیت
ہنسی ہنسی میں جو ہم نے بیان کر دی ہے

O

ہو گیا بے آرزو مَیں، آرزو کرتا ہوا
ایک روحِ گم شدہ کی جستجو کرتا ہوا

میں نے دیکھیں اس کی آنکھیں روشنی دیتی ہوئی
میں نے دیکھا اس کا چہرہ گفتگو کرتا ہوا

جابسا ہے خاک میں سجدہ گزاری کے لیے
وہ جو سیلِ آب سے نکلا وضو کرتا ہوا

وہ ٹھہرتا کاش ایسے، چھوڑ کر جاتا نہیں
اور گزرتا موت کے گھاؤ رفو کرتا ہوا

زندگی تھی ساتھ اس کے، وہ گیا پھر بھی ظفرؔ
سارے اسبابِ نمو کو بے نمو کرتا ہوا

O

اگر کٹ گئی آج زنداں میں رات
یہ ہستی نہ ہوگی کبھی بے ثبات

علم قتل گاہوں کے گرنے نہ دو
رکھیں یہ بلند آسماں تک حیات

چلو تو سدا سر اٹھا کے چلو
تمہیں راستا دے گی ہر کائنات

نہیں ہوتی جب تک یہ برخاست بزم
بنالو اگر کوئی بنتی ہے بات

ظفؔر جانبِ دار جاتا ہوں مَیں
اگر چل سکو تو چلو میرے ساتھ

O

جب سونے پنگھٹ پہ کسی مٹیار کی گاگر بولے
آ میں بجھاؤں پیاس تری، اک عشق سمندر بولے

آئے اور آباد کرے، سنسان حویلی من کی
جیون گنبد بیچ کوئی، بے چین کبوتر بولے

دریا بھی مہران کا چپ، صحرا بھی تھر کا چُپ ہے
میں بولوں یا سیہون کا، شہباز قلندر بولے

پہنچے گی فریاد کی لے، ہر حال میں اب شیریں تک
ہو جائے خاموش اگر فرہاد تو پتھر بولے

چاہے اسرافیل کوئی اب صور ہی پھونکے آ کر
بن کے میری روح ظفؔر مرے تن کے اندر بولے

○

خمارِ شب میں جو اک دوسرے پہ گرتے ہیں
وہ لوگ مے سے زیادہ نشے پہ گرتے ہیں

سمیٹ لے گا وہ اپنی کشادہ باہوں میں
جو گر رہے ہیں اسی آسرے پہ گرتے ہیں

یہ عشق ہے کہ ہوس، ان دنوں تو پروانے
دیے کی لَو کو بڑھا کر دیے پہ گرتے ہیں

گزارتا ہوں جو شب، عشقِ بے معاش کے ساتھ
تو صبح اشک مرے ناشتے پہ گرتے ہیں

علاجِ اہلِ ستم چاہیے ابھی سے ظفرؔ
ابھی تو سنگ ذرا فاصلے پہ گرتے ہیں

○

رستے بھر تصویر آنکھوں میں، بام و در کی آتی رہی
گھر گلزار نہیں تھا پھر بھی، خوشبو گھر کی آتی رہی

اس سے بچھڑ کے ایک اسی کا حال نہیں مَیں جان سکا
ویسے خبر تو ہر پل مجھ کو دنیا بھر کی آتی رہی

میں تو جتنے آئینوں میں عکس وفا کا اتار سکا
ہر آئینے میں دھندلاہٹ پس منظر کی آتی رہی

آس رہی بھیگی آنکھوں میں، وصل کنارے لگنے کی
من ساگر کے اندر جب تک، لہر ادھر کی آتی رہی

چاہے وہ مانے کہ نہ مانے، دل کا دھڑکنا جھوٹ نہ تھا
اتنی غفلت پر بھی اس کو، یاد ظفؔر کی آتی رہی

O

نصیب ہوں تو ان آنکھوں کے پار اُتر جائیں
بس اِک خمار ہو، باقی خمار اُتر جائیں

بدل رہے ہیں وہ راہیں جو اتنی تیزی سے
نجانے کون سے گھاٹ اپنے یار اُتر جائیں

ہمارا دل ہو کہ زینہ کوئی جدائی کا
جہاں اترنا ہے، وہ ایک بار اُتر جائیں

حوالے کس کے ظفرؔ دل کی آرزوئیں کریں
اگر نظر سے ترے شاہکار اُتر جائیں

O

جب شہر سے ہوائے محبت گزر گئی
پھر یہ ہوا کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

ہم سب بکھر گئے نئے دن کے سراغ میں
پھر خود کو جمع کرنے میں مدّت گزر گئی

ہم تک وہ لہر آ نہ سکی انبساط کی
طوفانِ درد سے جو سلامت گزر گئی

بے مہر موسموں میں بڑھا خوف اس قدر
پھولوں کو روندتی ہوئی خلقت گزر گئی

آنکھیں کُھلیں تو ہم پہ ظفؔر صرف یہ کُھلا
شامِ وصال و صبحِ مسّرت گزر گئی

O

کہیں کہیں ہوا منظر بہشت کا معلوم
وہ خواب تھا کہ حقیقت، نہیں ہُوا معلوم

بہت سے لوگ ترے رنگ میں ہیں ڈوبے ہوے
اسی لیے مجھے ہوتے ہیں آشنا معلوم

اٹھاؤ پلکیں کہ آنکھوں کی روشنی میں چلوں
کسی طرح ہو محبت کا راستا معلوم

تجھے خیال سے بھی آگے سوچتا ہوں مَیں
مجھے تُو سوچتا ہے یا نہیں، خدا معلوم

یہاں بھٹکتے بھٹکتے پہنچ گیا ہوں مَیں
وگرنہ سمت ہی معلوم تھی نہ جا معلوم

O

بال کُھلتے ہوے شانوں سے بکھرتی ہوئی شال
اور مَیں وصل کی لذّت سے ہوا مالا مال

سبھی چاہیں کہ بھرے زخم مگر مَیں چاہوں
تا قیامت رہے چاہت کا ہر اک زخم بحال

اس کی فرقت ہے عجب اور غضب قربت ہے
یعنی ملنا بھی محال اور بچھڑنا بھی محال

کون سی لہر میں اتروں تو ملے کوئی گہر
کون سے دشت میں بکھروں تو ملے کوئی غزال

چپ رہا جائے تو ممکن ہے بھرم رہ جائے
حال ایسا ہے کہ پوچھو نہ ظفؔر میرا حال

○

مری منزل تھی مستقبل مگر ماضی میں رہتا تھا
تغیّر سے الگ مَیں اپنی تنہائی میں رہتا تھا

وہاں اک عشق ظاہر بیں تھا اور اک حسن نا محرم
محبت نام تھا اس کا، مَیں جس بستی میں رہتا تھا

تلاشِ رفتہ میں، پیہم اڑائی خاک، لا حاصل
وہ جانے خاکداں کی کون سی پٹّی میں رہتا تھا

سلوکِ محرمانہ تھا فرشتے کی طرح لیکن
ہمیشہ وہ لباسِ آدمِ خاکی میں رہتا تھا

زیارت کر رہی ہے آج بھی اس کی یہی مٹی
ظفؔر وہ نور تھا، لیکن اسی مٹی میں رہتا تھا

○

آتے ہوئے پل سے آگے جھانکیں
جیسے تجھے ڈھونڈلیں گی آنکھیں

افلاک کے نیلے آنچلوں پر
ہم تیرے لیے ستارے ٹانکیں

ملبوس ہوں تیرا، اس طرح ہم
آنکھوں کو یہ پلکیں جیسے ڈھانکیں

کب تک یہ سفر نہ ختم ہوگا
کب تک یونہی خاک دھول پھانکیں

سوچوں کا ہے بے مُہار ریوڑ
آؤ اسے تھوڑی دیر ہانکیں

O

تل کی اوٹ میں شوبھا دیکھی، عینِ ذات کی مَیں نے
پھر سب گھڑیاں وہیں گزاریں، دن اور رات کی مَیں نے

تال تلیاً کی دلدل میں، جھیل کا حسن کہاں تھا
نین کنول پر مان تھا اس کو، نین سے بات کی مَیں نے

من اندر ہے صاحب میرا، باہر کیوں مَیں دیکھوں
اور نہ کوئی صورت پائی، اس کے ساتھ کی مَیں نے

کھیل کے مجھ کو جیت چکا وہ، ہار کے مَیں ہوئی اس کی
اسی لیے پروا ہی نہیں کی، اپنی مات کی مَیں نے

پہلے پریم کی شبنم اور پھر، ہلکی پھوار کی نرمی
بعد میں تو بوچھار ہی دیکھی، اک برسات کی مَیں نے

O

دلوں میں وہ تو نہیں جو بیاں سے ظاہر ہے
یہ کون جانتا ہے ہم میں کون کافر ہے

لگا یہ روگ بھی آخر ترے ثنا خواں کو
زباں ہے منہ میں مگر بولنے سے قاصر ہے

ترے عذاب نے الجھا دیا ہے ذہنوں کو
وگرنہ کون تری رحمتوں کا منکر ہے

ظفؔر کرے گا تجھے کس طرح نظر انداز
کتابِ زیست میں تُو مثلِ حرفِ آخر ہے

O

شکوہ کرتی رہی یوں کاغذِ خالی سے کتاب
جیسے تعبیر نہ ہو، جیسے کوئی بانجھ ہو خواب

تیرنا میرا نہ سمجھو مری ہستی کی دلیل
ایک سوکھے ہوئے پتّے نے کہا ہے سرِ آب

آشنا ہے ترا بستر تری ہر کروٹ سے
کیسے ہر آن بدلتا ہے محبت کا نصاب

ہم تو پتھرائی ہوئی آنکھیں لیے لوٹ آئیں
اس کے چہرے کو فقط دیکھتا ہے اس کا حجاب

دل کے ہمراہ بیاضیں بھی اگر لے جاتا
بوجھ بنتا نہ ظفرؔ مجھ پہ یہ میرا اسباب

O

لپٹی ہوئی کرن کوئی بادل کی شال میں
آ کے بجھی ہے میرے سیہ پوش حال میں

اب جا چکے ہیں روح کے پتّے بھی اُڑ کے دور
اب وہ خیال ہے اسے ملنا خیال میں

آگے رضا ہے اس کی کہ وہ کب کرے قبول
جاں کا جہیز رکھ دیا مٹّی کے تھال میں

دیکھا اگرچہ سب نے، مرا چاند بجھ گیا
لیکن پڑا نہ فرق ستاروں کی چال میں

میں ایک بار اُس کی محبت میں کیا کِھلا
آئی ہے بار بار خزاں ایک سال میں

O

کسی کی یاد میں کھو کے، کسی سے ہو کے الگ
گزاروں زندگی، اس زندگی سے ہو کے الگ

سبھی کے ساتھ ہوں، یہ بات الگ کہ سوچا تھا
میں تیرے ساتھ رہوں گا، سبھی سے ہو کے الگ

میں ڈھونڈتا ہوں اسے جو کہ تیرے نور سی تھی
اک اور روشنی اس روشنی سے ہو کے الگ

چلوں نہ کس لیے اس خوش خرام کے پیچھے
کسے ملا ہے خدا، بندگی سے ہو کے الگ

سخن کی اور کوئی راہ چاہتا ہوں ظفرؔ
رواج پاتی ہوئی شاعری سے ہو کے الگ

○

کام کرتے کوئی کیا انہونا
ہمیں بجھنا تھا نہ روشن ہونا

کتنا مشکل ہے محبت میں نباہ
کتنا آساں ہے سہاگن ہونا

اپنا جلنا بھی اکارت ہی گیا
ہمیں آیا نہیں کندن ہونا

وقتِ رخصت ہوے سب مرحلے طے
رہ گیا اک ترا درشن ہونا

O

کرتا ہوں جب علاحدہ خود کو ہجوم سے
تنہائی کا مَیں جشن مناتا ہوں دھوم سے

سنتا ہوں پھر بھی زرد ستاروں کی گفتگو
واقف نہیں اگرچہ مَیں علمِ نجوم سے

ہر رخ سے اک شگفتگی آئی ہے آپ میں
اب خود کو دور رکھیے گا بادِ سموم سے

پھیلانا پڑ رہے ہیں ہمیں جس کے آگے ہاتھ
کام اس کا چل رہا ہے ہماری رقوم سے

حالانکہ اس میں وارنا پڑتی ہے جاں ظفرؔ
برتر ہے عشق، دہر کی ساری رسوم سے

○

گرجا کی گھنٹیوں نے مری نیند تو اڑائی
تُو ہے کہاں کہ تیری صدا آج تک نہ آئی

انجیل سامنے تھی خدا سامنے نہ تھا
اس نے کتابِ زیست مجھے اس طرح پڑھائی

رنگت گلاب سی تھی کفن سا لباس تھا
جس راہبہ سے مجھ کو مہک زندگی کی آئی

اس نے بھی ایسٹر نہ منایا سکوں کے ساتھ
میں نے بھی ایک عمر سے دُھونی نہیں رمائی

دونوں ملول ہیں تو یہ کیسے کُھلے ظفرؔ
اس نے شکست کھائی کہ مَیں نے شکسُت کھائی

O

کنارے یوں تو بہت تھے ترے اشارے میں
زمانہ ڈوب گیا گفتگو کے دھارے میں

ترے وصال سے قوسِ قزح ہوئی ظاہر
ترے جمال سے آئی کشش نظارے میں

کبھی تجھے تو کبھی آسمان کو دیکھوں
چمک سی ہے ترے چہرے کی ہر ستارے میں

بہت کرم کیا مجھ پر کہ تم چلے آئے
ابھی مَیں سوچ رہا تھا تمہارے بارے میں

تم اتنے کھوئے ہوئے ہو جو شاعری میں ظفرؔ
زیادہ نفع میں ہو اور کم خسارے میں

○

ہزار خواب ہیں ہم خفتگانِ شب کے لیے
مگر وہ لوگ جو سوئے نہ اپنے رب کے لیے

یہ غائبانہ اذیت عجیب ہے کہ دعا
تجھی سے مانگ رہا ہوں تری طلب کے لیے

نمو پذیر ہے اے خاندانِ بے تاریخ
اک اور نام ترے شجرۂ نسب کے لیے

یہ لوگ اس طرح اجڑے ہوئے دکھائی نہ دیں
جو نشّہ ان کے لیے ہے اگر ہو سب کے لیے

بہ ایں ہمہ کہ نہ جھپکی کبھی پلک سرِ بزم
یہ عشق کم نظر آیا ترے ادب کے لیے

O

منزل کسی موڑ پر نہیں ہے
لیکن یہ تجھے خبر نہیں ہے

روہی کا ذرّہ ذرّہ بولے
یارانۂ بحر و بر نہیں ہے

ڈھلنا کسی شکل میں ہے مشکل
مٹی تو ہے، کوزہ گر نہیں ہے

اس دشت سے جا چکے پکھیرو
بکھرا ہوا کوئی پَر نہیں ہے

تُو جتنا قریب ہے، اجل بھی
اب اتنی قریب تر نہیں ہے

O

پاتال میں تم ہمیں رہنے دو صاحب، آکاش کنارے نہیں چاہئیں ہم کو
اپنا جیون تو ہیں ریت گھروندے، یہ پھول انگارے نہیں چاہئیں ہم کو

کہے رہ رہ کے اپنی دل درویشی، ہم تو چرانے والے مال مویشی
ہمیں چاہیے پیار کچہری میں پیشی، یہ محل منارے نہیں چاہئیں ہم کو

ہم کنکر ہمیں بھانویں کیا یہ ہیرے، ہم پنچھی ہمیں چاہئیں گھنے ذخیرے
ریتلی مٹی چاہے سینہ چیرے، تم سنگ سہارے نہیں چاہئیں ہم کو

وہاں جانا ہے وہاں دیکھنے ہیں سپنے، جہاں خوشیاں اپنی ہوں روگ ہوں اپنے
جہاں آنکھوں کے سامنے لوگ ہوں اپنے، نامحرم دوارے نہیں چاہئیں ہم کو

ظفر یہی جیون بندھن کافی ہے، اپنا ہو تو ایک بدن کافی ہے
سچی لگن کی ایک کرن کافی ہے، جھوٹے لشکارے نہیں چاہئیں ہم کو

O

تُو بھی کہیں مبتلا تو ہوگا
یعنی عشق آشنا تو ہوگا

منزل کی طرف جو لے کے جائے
رو ہی میں وہ نقشِ پا تو ہوگا

دنیا کسی کام کی نہیں ہے
افسوس تجھے ہوا تو ہوگا

خوشبو کا نہیں سراغ کوئی
گل ویسے کہیں کِھلا تو ہوگا

چھو کر جو ہوائیں آئیں تجھ کو
بادل انہیں چومتا تو ہوگا

O

آئے ہو سوئے شہر تو بازار دیکھنا
بکتے ہیں کیسے کیسے خریدار دیکھنا

اے شاخِ خوش نہال ترے گُل ہیں سرفراز
تجھ سے بکھر نہ جائے یہ دستار دیکھنا

عالم ہے ایک، جس میں زمانہ اداس ہے
لازم نہیں ہے وقت کی رفتار دیکھنا

ملبے تلے ہوں اور ترستا ہوں دھوپ کو
چاہا تھا مَیں نے سایۂ دیوار دیکھنا

ہونٹوں سے ہم کلام پیالہ ہے زہر کا
اس گفتگو میں جان کا آزار دیکھنا

O

فروغِ مے سے فروزاں تھا میکدہ سرِ شام
کلام کرتا رہا میرے قرب سے، کوئی جام

حروف جانتے ہیں رنج و راحتِ خطّاط
ظروف جانتے ہیں کوزہ گر کے صبح و شام

سخن کرو کہ خموشی اجل نہ بن جائے
پکارے ساز کہ میرا سکوت ہے انجام

صدائیں دیتا ہے محمل کہ وصل سے گزرو
وگرنہ عشق ہے بے رس، وگرنہ خواہشیں خام

بنائے گا، ظفؔر اس در کی خشت خشت گواہ
پہنچ ہی جائے گا اک دن وہاں تلک یہ غلام

O

کوئی ہے اگر تو دکھائی دے
اس اکیلے پن سے رہائی دے

کوئی راز ہے تو کُھلے کبھی
کوئی ساز ہے تو سنائی دے

کوئی غیر ہے مرے ساتھ اگر
مجھے زندگی بھی پرائی دے

نہیں دینا اپنا وصال اگر
مجھے موت جیسی جدائی دے

تری یاد بھی نہیں آ رہی
مجھے یاد تک تو رسائی دے

O

تقسیم ہو چکی ہے جو خانوں میں زندگی
کی تھی وہ جمع کتنے زمانوں میں زندگی

جاتا ہوں دشت کو، جہاں آزاد ہیں غزال
قیدی بنی ہوئی ہے مکانوں میں زندگی

زندان ٹوٹنے کی صدا سن رہا ہوں مَیں
محسوس ہو رہی ہے دوانوں میں زندگی

کوئی تو محتسب ہو جو اس کا حساب لے
برباد ہو چکی ہے جو تھانوں میں زندگی

چاروں طرف سسکتے ہوئے لوگ ہیں ظفرؔ
اب رہ گئی ہے چند گھرانوں میں زندگی

O

خود اپنے واسطے جاں کا وبال ہو جاؤں
تھکن کسی کو ہو اور مَیں نڈھال ہو جاؤں

اگا ہوا ہوں ہر اک جا مثالِ سبزہ مَیں
جہاں بھی پاؤں پڑے پائمال ہو جاؤں

ہوائے درد سے بے رنگ ہوں وگرنہ مَیں
رگِ گلاب سے لپٹوں تو لال ہو جاؤں

نہ مَیں رہوں نہ مری یاد ہی رہے صاؔبر
خدا کرے کہ فشارِ خیال ہو جاؤں

O

میں جس کے ساتھ ظفؔر عمر بھر اٹھا بیٹھا
وہ جانے آج ہے کیوں اجنبی بنا بیٹھا

شکایت اس سے نہیں اپنے آپ سے ہے مجھے
وہ بے وفا تھا تو میں آس کیوں لگا بیٹھا

جو میرے واسطے بنیاد تھا محبت کی
میں اس خیال کی بنیاد ہی گرا بیٹھا

ملا وہ رات مجھے محفلِ مسرت میں
تو میں ادب سے نہیں دکھ سے دور جا بیٹھا

ظفؔر بتاؤ اسے ہاتھ کیا لگا سکتا
جسے میں دیکھ کے بینائی ہی گنوا بیٹھا

○

مل نہیں رہا ہے تُو
ویسے ہر جگہ ہے تُو

ہر خزاں کی شاخ پر
پھول سا کھلا ہے تُو

سوچتا ہوں مَیں جسے
اس سے ماورا ہے تُو

ہر کوئی ہے اجنبی
صرف آشنا ہے تُو

مجھ کو مجھ سے چھین لے
کیا مرا خدا ہے تُو

○

بھٹک رہے ہیں کہ تشکیک دل سے جاتی نہیں
یہ اجتماعی ہے گمراہی، میری ذاتی نہیں

میں اصل ہی میں سماتا ہوں اصل سا ہو کر
کہ راہِ حق میں مجھے ذاتِ غیر بھاتی نہیں

اگر نہیں ہے تری ذاتِ پاک سے واقف
یہ کائنات حقیقت میں کائناتی نہیں

بس ایک تُو ہے فقط، دوسرا نہیں کوئی
تو کیا یہ اوروں کے جیون کی بے ثباتی نہیں

صفات سے ہے ظفؔر ماورا خدا کی ذات
وہ ذات اور بھی کچھ ہے فقط صفاتی نہیں

○

ہوا کے تار میں کچھ سسکیاں پرونے میں
سکون ہے تو فقط رفتگاں کو رونے میں

الگ الگ سہی لذّت مگر قیامت ہے
کسی سے دور کسی کے قریب ہونے میں

میں تیرے دھیان سے لپٹا ہوا ہوں ناز کے ساتھ
کہ جینا مرنا ہے میرا اسی بچھونے میں

وہ ہونٹ کاٹنے والی ادا نہیں بھولی
کبھی سمٹتے ہوئے سیڑھیوں کے کونے میں

گزار دی ہے ظفرؔ ساری زندگی آخر
کسی کو پانے میں ہم نے کسی کو کھونے میں

○

بادباں کھول دو پانی میں اتر جانے دو
سر سے طوفاں جو گزرنا ہے گزر جانے دو

چھوڑ آئے ہیں کنارے کو ہمیشہ کے لیے
اب تو جاتی ہے جدھر ناؤ ادھر جانے دو

واپس آئے تو بنالیں گے ٹھکانہ کوئی
ابھی ان ریت گھروندوں کو بکھر جانے دو

اپنے لوگوں سے پرے، اپنے در و بام سے دور
جی نہیں چاہتا جانے کو مگر جانے دو

اپنی مرضی سے اگر جینے نہیں دیتے تو پھر
اتنا احسان کرو ہم پہ کہ مر جانے دو

○

لب ہیں تو گلاب کس لیے ہیں
تم ہو تو یہ خواب کس لیے ہیں

جب مدھ بھرے نین ہیں تمہارے
پھر جامِ شراب کس لیے ہیں

جب پلکیں گھنیری ہیں تمہاری
جنت کے سحاب کس لیے ہیں

جب نُور ہے تن بدن تمہارا
مہر و مہتاب کس لیے ہیں

کافی ہے تمہاری چہرہ خوانی
ہم اہلِ کتاب کس لیے ہیں

O

ادھر بھی کچھ نہیں، جا کے ادھر ہوا معلوم
سو اب ہے صرف بھٹکنے کا راستا معلوم

مجھے پکارنے والا نہیں ہے اور کوئی
اسی لیے ہے مجھے ایک ہی صدا معلوم

اگر یہ رنگ ترے رنگ سے نہیں نکلا
تو پھر یہ ہوتا ہے آنکھوں کو کیوں بھلا معلوم

میں صَرف ہوتا ہوں حتیٰ کہ مَیں نہیں رہتا
نہ ہو یہ کاش کسی کو ترے سوا معلوم

ہمیشہ ٹھیک نہیں رونمائیاں اتنی
کبھی کبھی رہو گم نام اور نا معلوم

○

ممکن ہے جتنا، اس سے زیادہ بکھیر دے
میں خود یہ چاہوں، میرا برادہ بکھیر دے

یہ شام ماتمی ہے تو ممکن نہیں نشہ
یعنی سبو بکھیر دے، بادہ بکھیر دے

ایسا نہ ہو کہ نیتِ شب ہی حرام ہو
کنگن کو توڑ دے، شبِ وعدہ بکھیر دے

زندانِ آرزو میں پڑا ہے مرا وجود
سارا بکھیر دے کہ وہ آدھا بکھیر دے

کیوں دیر ہو بساط الٹنے میں پھر ظفرؔ
جب خاکِ بادشاہ، پیادہ بکھیر دے

O

ساتھ تیرے، ترا ہمزاد نہیں رہ سکتا
رشتۂ نسبتِ اجداد نہیں رہ سکتا

اب تو بارود سے ہوتی ہے یہاں کوہ کنی
اب مَیں ہم پیشۂ فرہاد نہیں رہ سکتا

پسِ ہنگامِ رہائی ہے صدائے زنجیر
یعنی مَیں دیر تک آزاد نہیں رہ سکتا

رونا اس کا ہے کہ ہوں خانماں برباد یہاں
اور یہاں خانماں برباد نہیں رہ سکتا

اپنے مطلب کے لیے جس نے عقائد بدلے
صابر اب وہ مرا استاد نہیں رہ سکتا

O

پڑا نہ فرق انوکھی زبان لکھنے سے
زمیں، زمیں ہی رہی آسمان لکھنے سے

نہ جس سے کوئی تعلق رہا کبھی میرا
وہ بن سکا نہ مری جان، جان لکھنے سے

پناہ مل نہ سکی ایک پل کبھی مجھ کو
کسی اجاڑ جگہ کو مکان لکھنے سے

کڑی تپش سے جھلستا رہا بدن میرا
کہ دھوپ، دھوپ رہی سایبان لکھنے سے

کنارے لگ نہ سکی ڈوبتی ہوئی کشتی
کسی بھنور کو ظفرؔ بادبان لکھنے سے

○

ہر طرف زندگی کی خوشبُو ہے
اس کا مطلب ہے چار سُو تُو ہے

جل رہا ہے جو آج رو ہی میں
وہ دیا تو نہیں ہے آنسو ہے

یہ جو مَیں، مَیں نظر نہیں آتا
تیری آنکھوں کا یہ بھی جادو ہے

یہ نہیں دیکھتا ہے چولستان
کون مسلم ہے کون ہندو ہے

ریت میں تولتا ہے تھل سب کو
یہی اس پاس، اک ترازو ہے

O

ہو نہ سکا آج تک، ہم سے تو قائل وہی
اس کے تقاضے نئے، اپنے وسائل وہی

اس کے بھی دوارے پھرے، دن نہ ہمارے پھرے
دربدری ہے وہی، کاسۂ سائل وہی

تخت بھی اب اور ہے، بخت بھی اب اور ہے
پھر بھی وہی ظلم ہے، پھر بھی مسائل وہی

آج بھی باقی ہے وہ، پہلے رقابت جو تھی
اس کے مرے درمیاں، لوگ ہیں حائل وہی

اس کا مرا اختلاف، ختم ہو کیسے ظفرؔ
اس کی شکایات اور، میرے دلائل وہی

O

اب خود سے مجھے قریب تر کر
آیا ہوں مَیں جان سے گزر کر

یہ فاصلے یوں نہ ختم ہوں گے
اب آگے خیال میں سفر کر

ملتی مجھے بار بار اگر زیست
میں دیکھتا بار بار مر کر

گردِ رہِ یار ہو چُکا ہُوں
کیا اور کروں گا مَیں بکھر کر

غم، عشق سے کر رہا ہے غافل
اس بات پہ غور اے ظفؔر کر

O

جو عشق بعد میں ہوگا، ملال بعد میں ہوگا
ہمارا حال ہوا کیا، سوال بعد میں ہوگا

ہمارا سانس کہ اس سانس میں اترتے اترتے
ابھی تو ٹوٹ رہا ہے بحال بعد میں ہوگا

کبھی حجاب ہے مانع، کبھی سراب ہے مانع
ابھی ہے دید کا نشّہ، وصال بعد میں ہوگا

فروغِ حسنِ ازل ، انتہاے عشقِ مسلسل
یہ کارِ سلطنتِ ماہ و سال بعد میں ہوگا

ابھی وہ بات ظفرؔ کیوں، ابھی وہ حال ظفرؔ کیوں
جو بات بعد میں ہوگی، جو حال بعد میں ہوگا

○

وہ جذب و کیف وہ مستی وہ والہانہ پکار
اور ان کے چاروں طرف کوئی غائبانہ پکار

وہ اس کا گھومنا، بازاروں اور قریوں میں
وہ اس کا بولنا، جیسے ہو عاشقانہ پکار

وہ اس کا دار کی لکڑی کو خوں سے کرنا سرخ
وہ اس کی، موت کے پنجرے میں، طائرانہ پکار

وہ ماورائے زمان و مکان ایک وجود
وہ جس کی سنتا رہا ہے ہر اک زمانہ پکار

وہ جس کا کعبہ، کوئی ذات کا نہاں خانہ
وہ سننے والا، کوئی اندرونِ خانہ پکار

○

نہ کیا تھا جو عشق، کر دیکھا
یعنی جی دیکھا، یعنی مر دیکھا

ایک ہی شخص سے محبت کی
ایک ہی خواب عمر بھر دیکھا

ایک ہی در پہ سجدہ ریزی کی
یعنی ہر سمت ایک دَر دیکھا

صرف چاہا اسے، اگر چاہا
صرف دیکھا اسے، اگر دیکھا

کاش اسے ایسے دیکھ سکتا مَیں
جیسے مٹّی نے کوزہ گر دیکھا

O

خموشیوں کی خاک میں دلوں کو رولتے یہ زندگی گزر گئی
غبار کی طرح زباں سے کچھ نہ بولتے یہ زندگی گزر گئی

ہم اپنے اپنے گھر میں قید تھے تو ہم پہ بند تھیں تمام کھڑکیاں
اور اس سے پیشتر کہ کھڑکیوں کو کھولتے یہ زندگی گزر گئی

وہ زندگی سے دور ہو گیا تو ہم بھی زندگی سے دور ہو گئے
پھر اپنے جسم و جاں میں کوئی زہر گھولتے یہ زندگی گزر گئی

کبھی لگا کہ سانس کی گرہ میں زندگی ہے اور کبھی لگا نہیں
اسی طرح متاعِ زندگی ٹٹولتے یہ زندگی گزر گئی

اگرچہ منزلیں ہماری منتظر تو ہوں گی آج بھی مگر ظفر
کہاں کی منزلیں کہ راستوں میں ڈولتے یہ زندگی گزر گئی

O

یہاں نہیں ہے اگر روشنی، یہاں سے نکل
اور اس سے پہلے کہ گر جائے، اس مکاں سے نکل

عجب ترنگ ہے تنہا بھٹکتے رہنے میں
نہیں ہے کوئی بھی منزل تو کارواں سے نکل

سبھی خموش ہیں اور منتظر بہار کے ہیں
خزاں سے کون کہے، صحنِ گلستاں سے نکل

مخل ہے میرے سخن میں، اک ایسے عجز کی پھانس
جسے مَیں کہہ نہیں سکتا، مری زباں سے نکل

جہان اور بھی ہوں گے ظفؔر، تلاش تو کر
خیال ہی میں سہی، قیدِ دو جہاں سے نکل

○

کسی نے کب کہیں جینے کا اختیار دیا
تجھے اجل نے مجھے زندگی نے مار دیا

کسی سے عشق کا اظہار جس میں کرنا تھا
خبر نہیں کہ وہ لمحہ کہاں گزار دیا

عجیب آنکھ مچولی یہ مرگ و زیست کی ہے
ابھی تو دل ترا جیتا ہی تھا کہ ہار دیا

نثار اس پہ سفر کی تمام رنگینی
وہ جس نے میرے پلٹنے پہ مجھ کو پیار دیا

تمام عُمر کیا تیرے قرب کو محسوس
بچھڑ گئے تو اسے رنگِ انتظار دیا

O

رنگ ہی رنگ ہیں، تصویر نہیں ہے کوئی
اور اس خواب کی تعبیر نہیں ہے کوئی

در و دیوارِ محبت تھے سبھی بے بنیاد
اور اب حسرتِ تعمیر نہیں ہے کوئی

اپنی اپنی ہیں صلیبیں سبھی احباب کے پاس
اب مرے حلقے میں زنجیر نہیں ہے کوئی

پُرزے پُرزے ہوئی جاتی ہے کتابِ ہستی
اور کسی پُرزے پہ تحریر نہیں ہے کوئی

داستاں ظلم کی خود لکھتے ہو کیوں مظلومو
کیا یہاں کاتبِ تقدیر نہیں ہے کوئی

○

شام سے پہلے تری شام نہ ہونے دوں گا
زندگی مَیں تجھے ناکام نہ ہونے دوں گا

اڑتے اڑتے ہی بکھر جائیں پر و بال اے کاش
طائرِ جاں کو تہہِ دام نہ ہونے دوں گا

بے وفا لوگوں میں رہنا تری قسمت ہی سہی
ان میں شامل مَیں ترا نام نہ ہونے دوں گا

کل بھی چاہا تھا تجھے، آج بھی چاہا ہے کہ ہے
یہ خیال ایسا جسے خام نہ ہونے دوں گا

لگنے دوں گا نہ ہوا تجھ کو خزاں کی مَیں ظفرؔ
پھول جیسا ترا انجام نہ ہونے دوں گا

○

نئی غزل میں تغزل کہاں سے آئے گا
اجڑ چکا ہے چمن، گُل کہاں سے آئے گا

ہر ایک سمت ہے پھیلی ہوائے اشک آور
اب ایسے باغ میں بلبُل کہاں سے آئے گا

سخن میں اپنا اثاثہ ہی صفر ہے یعنی
یہاں تو جزو نہیں کُل کہاں سے آئے گا

حوالے خود ہی کیا جب سلگتی ڈولی کے
دلاسہ دینے کو بابُل کہاں سے آئے گا

یہ شہرِ آب ہے تم کس سراب میں ہو ظفرؔ
یہاں کنارہ نہیں، پُل کہاں سے آئے گا

○

گریز پا ہے جو مجھ سے اسی کے پاس بہت ہوں
میں اپنے وعدے پہ قائم ہوں اور اداس بہت ہوں

یہ قید وہ ہے کہ زنجیر بھی نظر نہیں آتی
یہ پیرہن ہے کچھ ایسا کہ بے لباس بہت ہوں

نہیں شریکِ سفر وہ مگر ملال بہت ہے
کہ جس مقام پہ بھی ہوں مَیں اس کی آس بہت ہوں

خموش اس لیے رہتا ہوں، میرے سامنے تُو ہے
میں کم سخن سہی لیکن نظر شناس بہت ہوں

کٹا ہے وقت فقط، زندگی نہیں کہ ظفرؔ مَیں
طلب سے اور تغافل سے روشناس بہت ہوں

○

دل تو مل جاتے ہیں راضی بہ رضا ہونے سے
تن بدلتے نہیں ملبوس نیا ہونے سے

اس بھرے شہر میں اب کوئی ٹھکانا ہی نہیں
گھر ہیں آباد فقط دل میں جگہ ہونے سے

اپنے ہونے کا گماں ہو تو یہی ہوتا ہے
ہو گیا مَیں بھی نہ ہونے کی طرح ہونے سے

دل میں دھڑکن کی طرح ہو گی سکونت میری
میں اگر بچ گیا صحرا کی صدا ہونے سے

میری بخشش کا یہ امکان کہاں سے نکلا
رہ گئی ہو گی ظفرؔ کوئی خطا ہونے سے

O

چاہیے اب تو اے خدا، اور ہی مہرباں مجھے
غیر تو خیر غیر ہیں، بھول گئی ہے ماں مجھے

بے خبری یہاں خبر، بے ہنری یہاں ہنر
تُو نے بہ ایں شعورِ فن، بھیج دیا کہاں مجھے

اس نے مرے نصیب میں، لکھ دیا خشک وتر کا کرب
بخش کے شہرِ اشک میں، قطعۂ ارضِ جاں مجھے

دھوپ میں اس کا روپ تو، یاد نہیں رہا مگر
ابر کی ٹکڑیاں ظفرؔ، لگتی تھیں چھتریاں مجھے

○

کاش کچھ روز رہوں پانیوں اندر ایسے
رقص جل پریوں کا جیسے کوئی لنگر دیکھے

ایک طائر نے جو دیکھے تو بھری لمبی اڑان
ٹوٹتے جام، رفاقت کے اترتے نشّے

اڑتے سارس نے محبت سے مجھے دیکھا تھا
میں بھی ساتھ اُڑتا، اگر پَر نہ بکھرتے میرے

یاد رہتا ہے کسے دشت مگر بھولا نہ مَیں
ریت وہ اڑتی ہوئی اور اکھڑتے خیمے

لیمپ کے شیڈ نے جو روشنی روکی ہے ظفؔر
کاش ایسا ہو کہ وہ کام کسی کے آئے

O

مصر نہیں کہ سمندر میں گھر دیا جائے
شریک بس مجھے لہروں میں کر دیا جائے

بکھر رہا ہوں سو میرے بدن کی مٹی کو
سمیٹنے کے لیے کوزہ گر دیا جائے

نہ ہو مجھے کوئی احساسِ دوریٔ منزل
سفر شناس اگر ہم سفر دیا جائے

اگر کمی نہیں جور و جفا میں ہو سکتی
تو میری آہ و فغاں میں اثر دیا جائے

تمام عمر مری خواہشوں کا خون ہوا
سو خوں بہا، مجھے صابر ظفر دیا جائے

○

میں ٹوٹی سیڑھیوں میں مضطرب تھا اور وہ چھت پر
ذرا دوری تھی لیکن تھے بہت نازاں محبت پر

وصال اپنی کہانی آپ لکھتا اور ہم پڑھتے
اگر آمادہ دونوں کے بدن ہوتے بغاوت پر

سجا رکھّی تھی اس شب، سیج اپنی گرم سانسوں کی
کوئی جشنِ چراغاں تھا جہاں پہلی رفاقت پر

لپٹ جاتی ہے مجھ سے ریگِ صحرا، جب ادھر جاؤں
دوانے رقص کرنا چاہتے ہیں میری وحشت پر

بھری محفل میں دیکھا تھا مجھے بھی ایک بار اس نے
ظفؔر اک عمر اتراتا رہا مَیں اس عنایت پر

○

اس زندگی سے آگے کوئی زندگی تو ہے
ہم دیکھیں یا نہ دیکھیں مگر روشنی تو ہے

پُر کرنا چاہتے ہیں جسے اپنی جاں سے ہم
اس خلوتِ اجل میں کوئی دل کشی تو ہے

ایسا نہیں کہ ردِّ عمل ہی نہیں کوئی
اس کی طرف سے اپنے لیے بے رخی تو ہے

یہ شہر اک کشادہ قفس ہی سہی مگر
تھوڑی بہت سہولتِ آوارگی تو ہے

کچھ اور اگر نہیں ہے تو پروا نہیں ظفرؔ
دل تو ہمارے پاس ہے، دیوانگی تو ہے

O

ستارے سو گئے تو آسماں کیسا لگے گا
جہانِ تیرگی میں یہ جہاں کیسا لگے گا

بچھڑ کے ساحلوں سے موجِ دل کیسی لگے گی
بکھر کے آندھیوں میں بادباں کیسا لگے گا

ٹھہر جائیں گی جب یہ کشتیاں کیسی لگیں گی
گزر جائے گا جب آبِ رواں کیسا لگے گا

بکھر جائیں گی زنجیریں سبھی زندانیوں کی
زوالِ نخوتِ نامہرباں کیسا لگے گا

جہاں تم سے بہت پہلے پہنچ جائیں گے ہم لوگ
نجانے آخری وہ خاکداں کیسا لگے گا

O

تری پناہ میں ہے، زندگی اگر ہے بھی
یہی تو ایک خوشی ہے، خوشی اگر ہے بھی

جیوں تو کیسے جیوں دور کوٹ مٹھّن سے
یہاں مِٹھل تو نہیں ہے، کوئی اگر ہے بھی

تری جدائی میں دل ہو گیا ہے چولستان
اک آدھ بوند لہو ہے، نمی اگر ہے بھی

لبھائیں دل نہ مرا، لانڈھی اور لسبیلہ
وہ تیری جھوک میں ہے، دل کشی اگر ہے بھی

تمام عمر رلائے گا، آنکھ لگ جانا
پُنھل کہیں بھی نہیں، اونٹنی اگر ہے بھی

○

گرے ہوؤں کو ضروری ہے کیا، اٹھا دینا
کہ جب اٹھیں تو وہ چاہیں ہمیں گرا دینا

چھپا کے رکھتے ہیں، جلتا ہوا وجود اُن سے
کہ اُن کا کام تو ہے، آگ کو ہوا دینا

مقامِ عشق کو رکھتے ہیں پُر ہمیشہ ہم
سرشت اپنی نہیں دوسروں کو جا دینا

غنیم آ نہ سکے کوئی بھی تعاقب میں
جہاں بھی جانا وہاں نقشِ پا مٹا دینا

ہمارے بس میں نہیں تو ہے کس کے بس میں ظفرؔ
کسی خیال کو بھی شاعری بنا دینا

○

ایسی تو زمیں یہاں نہیں ہے
جس پر کوئی آسماں نہیں ہے

کس رنگ میں تُو نہیں ہے ظاہر
کس چشم پہ تُو عیاں نہیں ہے

عالم پہ محیط حسن تیرا
عالم میں تُو کہاں نہیں ہے

تُو سب کا راز داں ہے لیکن
تیرا کوئی راز داں نہیں ہے

گہرا ہے حجاب تیرا جیسے
ایسا تو کوئی نہاں نہیں ہے

O

نہ مَیں خاک پر، نہ مَیں چاک پر، مرے کوزہ گر
مَیں کہاں ہوں گم، مجھے دے خبر، مرے کوزہ گر

مَیں بہار اور خزاں سے قدرے الگ بھی ہُوں
مرے موسموں سے کبھی گزر، مرے کوزہ گر

مجھے خاک داں میں زیادہ دیر نہ قید رکھ
بڑی دور کا ہے مرا سفر، مرے کوزہ گر

جو بنایا ریت سے کوزہ وہ تو بکھر گیا
چلو نام لکھتے ہیں ریت پر، مرے کوزہ گر

میں یہاں نہیں مَیں وہاں نہیں مَیں کہیں نہیں
مرے ہونے ہی سے نہ تُو مکر، مرے کوزہ گر

O

ملالِ رفتہ کو آئندہ سے ملا رکھنا
اور اپنی جان کو آزار سا لگا رکھنا

وہ خاک اچھالے تو اپنا لہو اچھالنا تم
اور اس کے سامنے تصویرِ کربلا رکھنا

یہ کس کے آنے سے لرزا ہے آج تختۂ دار
یہ کس کو آیا ہے ایسے قدم جما رکھنا

ہم اپنے زخموں کی پھلواریاں کہاں لے جائیں
تمہیں تو آتا ہے، محرومیاں چھپا رکھنا

کہ رکنے والا رکے، جانے والا جائے ظفرؔ
کسے، چراغ کو آتا ہے یوں بجھا رکھنا

○

خوشبو تو سیرِ دشت کو جائے ہوا کے ساتھ
آنگن کہاں چلا تری آوازِ پا کے ساتھ

بھیجے ہیں آج تک تو درود و سلام ہی
آیا ہوں پہلی بار دلِ مبتلا کے ساتھ

اے کاش ہو قبول کسی طور حاضری
پَر تولتی ہے روح بھی میری دعا کے ساتھ

میں چاہتا ہوں آپ سے قربت اسی طرح
جیسا کہ آپ کا ہے تعلّق خدا کے ساتھ

اب آپ کے بغیر جیے گا نہیں ظفؔر
ویسے تو سانسیں جاری ہیں صبر و رضا کے ساتھ

○

پیرہن ہی کی نہیں کوئی خبر تو کیا ہے
میں برہنہ بھی چلا جاؤں ادھر تو کیا ہے

جب اتر ہی گئے ہم اس کی نظر سے تو پھر
وہ اگر دیکھ بھی لے ایک نظر تو کیا ہے

دل جو لذت میں گرفتار ہو وہ کیا جانے
اصل کیا ہے یہاں اور اصل کا پَر تو کیا ہے

دُھوپ کے رُوپ جو دل کش ہیں انہیں یاد رکھو
کسی رستے میں نہیں کوئی شجر تو کیا ہے

نامراد اور بھی گزرے ہیں بہت دنیا میں
ان میں شامل ہے اگر ایک ظفؔر تو کیا ہے

○

آگے چلتا ہے کبیؔر اور مَیں پیچھے اس کے
میری غزلوں میں سمٹ آئے ہیں دوہے اس کے

اس کے پنگھٹ پہ مجھے پیاس احد کی لائی
پانی اس کا ہے، کنواں اس کا ہے، مٹکے اس کے

وہ جو برہم ہے مِری سمت وہ آتا کم ہے
میرا کوئی نہیں اس جگ میں سوائے اس کے

پریم کی چھاؤں میں بیٹھی ہوئی چڑیا ہے کوئی
اور ٹھکانے ہیں سبھی انت سے آگے اس کے

راز کرتی نہیں ظاہر وہ کسی پر اپنا
ہاں چہکنے سے کُھلیں بول ذرا سے اس کے

O

کیا خبر تھی تُو گھر نہ آئے گا
اور پھر عمر بھر نہ آئے گا

کیا کبھی آئے گی نہ یاد تری
کیا کبھی لوٹ کر نہ آئے گا

کیا کہیں بھی نہ مل سکے گا تو
کیا کہیں بھی نظر نہ آئے گا

میں تو یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا
تُو مری موت پر نہ آئے گا

یہ تری بھول ہے کہ تیری طرف
تیرا صابر ظفؔر نہ آئے گا

O

سوال کو نہ کریں حل، دعا کیے جائیں
وہ بے عمل ہیں جو ہر پل، دعا کیے جائیں

محبتوں سے نہ کھولیں دلوں کے دروازے
دلوں کو کر کے مقفّل، دعا کیے جائیں

گناہ بھی کیے جائیں کوئی مسلسل ہم
اور اس کے بعد مسلسل، دعا کیے جائیں

یہ زندگی بھی فریب اور بندگی بھی فریب
خدا کو بھول کے پاگل، دعا کیے جائیں

بنائیں آپ ہی مقتل جو اس نگر کو ظفرؔ
نہ یہ نگر بنے مقتل، دعا کیے جائیں

○

یاد پھر دل کو چھو گئی کوئی
منتظر ہے مرا ابھی کوئی

ایک ہی شخص کیوں ملا نہ ہمیں
کبھی کوئی ملا کبھی کوئی

بات ہوتی تو کوئی بات بھی تھی
بات ہی تو نہیں ہوئی کوئی

پھر کسی اجنبی کی یاد آئی
کاش رہتا نہ اجنبی کوئی

جی رہا ہے ترے بغیر ظفؔر
زندگی ہے یہ زندگی کوئی

O

میں کیسے دل کو سنبھالوں کہ دلربا گم ہے
اور اب کہاں اسے ڈھونڈوں کہ ہر پتا گم ہے

رہِ وفا کا مسافر ہے میری آنکھوں میں
مگر مَیں دیکھ رہا ہوں رہِ وفا گم ہے

یہ اہلِ دہر اسے دہر میں عبث ڈھونڈیں
خُدا کی راہ میں جو بندۂ خدا گم ہے

میں چپ نہیں ہوں، سمجھنا نہیں یہ، مَیں چپ ہوں
کہ شورِ نوحہ گری میں مری صدا گم ہے

بجھا چکی ہے ہَوا، میرا ایک ایک چراغ
میں رہ گیا ہوں تو جانے کہاں ہوا گم ہے

O

بجائے زندگی اب موت ہے کہانی میں
ڈبو دیا مرے لوگوں کو اس نے پانی میں

وہ نرم ہاتھ وہ آنکھیں وہ پھول سے چہرے
گھروندے جن کے بہے ریت کی روانی میں

تھیں کشتیاں بھی، کنارے بھی اور سہارے بھی
سو غرق ہو گیا سب کچھ غلط بیانی میں

بچا سکا نہ کبھی ڈوبتی رعایا کو
ہر آنے والا رہا مست حکمرانی میں

برائے پُرسشِ پسماندگانِ یار جو ہم
گئے تو ڈوب گئے غم کی بیکرانی میں

○

پرندوں سے کہو پنجروں کے در کُھل کے رہیں گے
بہار آ کے رہے گی، بال و پر کُھل کے رہیں گے

کسی بھی موڑ پر اب تم کو مل جائے گی منزل
سفر کے راز دورانِ سفر کُھل کے رہیں گے

جدھر جاؤ گے پاؤ گے وفاؤں کے وسیلے
کہ منظر حسن کے ہر آنکھ پر کُھل کے رہیں گے

تغافل بھی ہے شوخی بھی، ادا بھی ہے حیا بھی
مگر سب پیچ و خم قبلِ سحر کُھل کے رہیں گے

ہوا دستک نہ دے گی تو لگائیں گے صدا ہم
دریچے بند ہیں جتنے ظفرؔ کُھل کے رہیں گے

○

میں گریز کیا کرتا، اس کے ساتھ چلنے سے
زخم تو نہیں بھرتا، راستا بدلنے سے

عشرتِ شبانہ تو یار کی رضا سے ہے
یہ خوشی نہیں ملتی، صرف شام ڈھلنے سے

آرزو کی چنگاری، کب تلک سلگ سکتی
بجھ گیا ہے دل آخر، بار بار جلنے سے

زندگی کا ہر مہرہ، بے رخی کے رخ پر ہے
یہ بساط الٹے گی، ایک چال چلنے سے

ڈوبتا ہوا سورج، کیا مجھے اُجالے گا
میں چمک اٹھوں شاید، چاند کے نکلنے سے

○

جہاں سے تنگ ہے جاں سے گزرنا چاہتا ہے
جس آدمی کو بھی دیکھو وہ مرنا چاہتا ہے

وہ عکس ہے کسی آئینے کی ہے اس کو تلاش
وہ نقش ہے کسی دل پر ابھرنا چاہتا ہے

سحر کا نور ہے اور یہ ہے مدّعا اس کا
حصارِ شب سے نکل کر بکھرنا چاہتا ہے

یہ راز کچھ نہیں کھلتا کہ آج کا انسان
بگڑنا چاہتا ہے یا سنورنا چاہتا ہے

اب اس سے میرا یہی اختلاف ہے صابرؔ
میں جینا چاہتا ہوں اور وہ مرنا چاہتا ہے

O

کوئی تو ترکِ مراسم پہ واسطہ رہ جائے
وہ ہم نوا نہ رہے، صورت آشنا رہ جائے

عجب نہیں کہ مرا بوجھ بھی نہ مجھ سے اٹھے
جہاں پڑا ہے زرِ جاں وہیں پڑا رہ جائے

میں سوچتا ہوں مجھے انتظار کس کا ہے
کواڑ رات کو گھر کا اگر کھلا رہ جائے

کسے خبر کہ اسی فرشِ سنگ پر سو جاؤں
مرے مکان میں بستر ا مرا بچھا رہ جائے

ظفرؔ ہے بہتری اس میں کہ مَیں خموش رہوں
کھلے زبان تو عزّت کسی کی کیا رہ جائے

○

کھدائی کو کھنڈر کوئی نہیں ہے
اب اس مٹّی میں زر کوئی نہیں ہے

خیالوں میں یہ کس کی دستکیں ہیں
اگر بیرونِ در کوئی نہیں ہے

وہاں لوگوں کے کیا دکھ درد ہوں گے
جہاں اب نوحہ گر کوئی نہیں ہے

جدھر چاہو نکل جاؤ سفر کو
فصیلِ بحر و بر کوئی نہیں ہے

میں کیوں اب گھر کی تختی پر نہ لکھ دوں
یہاں صابرؔ ظفر کوئی نہیں ہے

○

ہر ایک مرحلۂ درد سے گزر بھی گیا
فشارِ جاں کا سمندر وہ پار کر بھی گیا

خجل بہت ہوں کہ آوارگی بھی ڈھب سے نہ کی
میں دربدر تو گیا لیکن اپنے گھر بھی گیا

یہ زخمِ عشق ہے کوشش کرو ہرا ہی رہے
کسک تو جا نہ سکے گی اگر یہ بھر بھی گیا

گزرتے وقت کی صورت ہوا نہ بیگانہ
اگر کسی نے پکارا تو مَیں ٹھہر بھی گیا

O

اب کہیں اور کہاں خاک بسر ہوں ترے بندے جا کر
زندگی اور بھی مغموم لگے شہر سے آگے جا کر

عدم آباد کے لوگوں کا مزاج ان دنوں کیسا ہوگا
لوٹ آنے کی توقع ہو کسی کو تو وہ پوچھے جا کر

میں گھنا پیڑ ہوں ، آیا بھی کبھی جو مرے سائے کو زوال
ان خزاؤں سے بہت دور گریں گے مرے پتّے جا کر

کٹ بھی سکتے ہیں شب و روز مرے، ان ہی گلی کوچوں میں
تیری جانب ہی اگر لوٹنا ہے تیرے نگر سے جا کر

شاعری پھول اگانے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے تو ظفؔر
باغ ہی کوئی لگاتا کہ جہاں کھیلتے بچّے جا کر

○

کیا خبر لوٹ کر پھر کبھی مَیں نہ آؤں یہاں الوداع
آج تجھ میں مری آخری رات ہے اے مکاں الوداع

رات ڈھلنے کو ہے دن نکلنے کو ہے رت بدلنے کو ہے
اس سے پہلے کہ دنیا رکاوٹ بنے درمیاں الوداع

پھول کھلنے کے دن، زخم سلنے کے دن، اس کے ملنے کے دن
اب قریب آ گئے ہیں تو اے فصلِ نامہرباں الوداع

دن نکلتے ہی تجھ سے جدا کر رہا ہے غمِ روزگار
پھر صدا دے رہا ہے مجھے چمنیوں کا دھواں الوداع

کوچ کرنے سے پہلے دعا کر رہا ہوں کہ وہ بھی ظفرؔ
شہر والوں کے ہمراہ آ کر کہے میری جاں الوداع

○

بت بنے بیٹھنا، پہلو بھی بدلتے رہنا
ملنا خوش خوش مگر اندر سے پگھلتے رہنا

کیا خبر شعلۂ تصویر ہی کندن کر دے
آخری پور تلک دھیان میں جلتے رہنا

اتنے بے حس کبھی پہلے نہ تھے، شاید تم نے
زندگی جان لیا عمر کا ڈھلتے رہنا

ہم نہ آئے تو کوئی اور بہار آئے گی
یاد کرنا ہمیں اور پھولتے پھلتے رہنا

شعر کہنے کا سفر ایسا ہے جیسے کہ ظفرؔ
دائرے کھینچنا، پھر ان سے نکلتے رہنا

○

خزاں کی رت ہے جنم دن ہے اور دُھواں اور پھول
ہوا بکھیر گئی موم بتّیاں اور پھول

وہ لوگ آج خود اک داستاں کا حصہ ہیں
جنہیں عزیز تھے قصے، کہانیاں اور پھول

یہ سب ترے مرے اظہار کی علامتیں ہیں
شفق کے رنگ میں شعلہ، لہو، زباں اور پھول

یقین کر کہ یہی ہے بجھے دلوں کا علاج
تری وفا، تری چاہت، ترا گماں اور پھول

ظفؔر میں صورتِ خوشبو قیام کرتا ہوں
سو ایک سے مجھے لگتے ہیں سب مکاں اور پھول

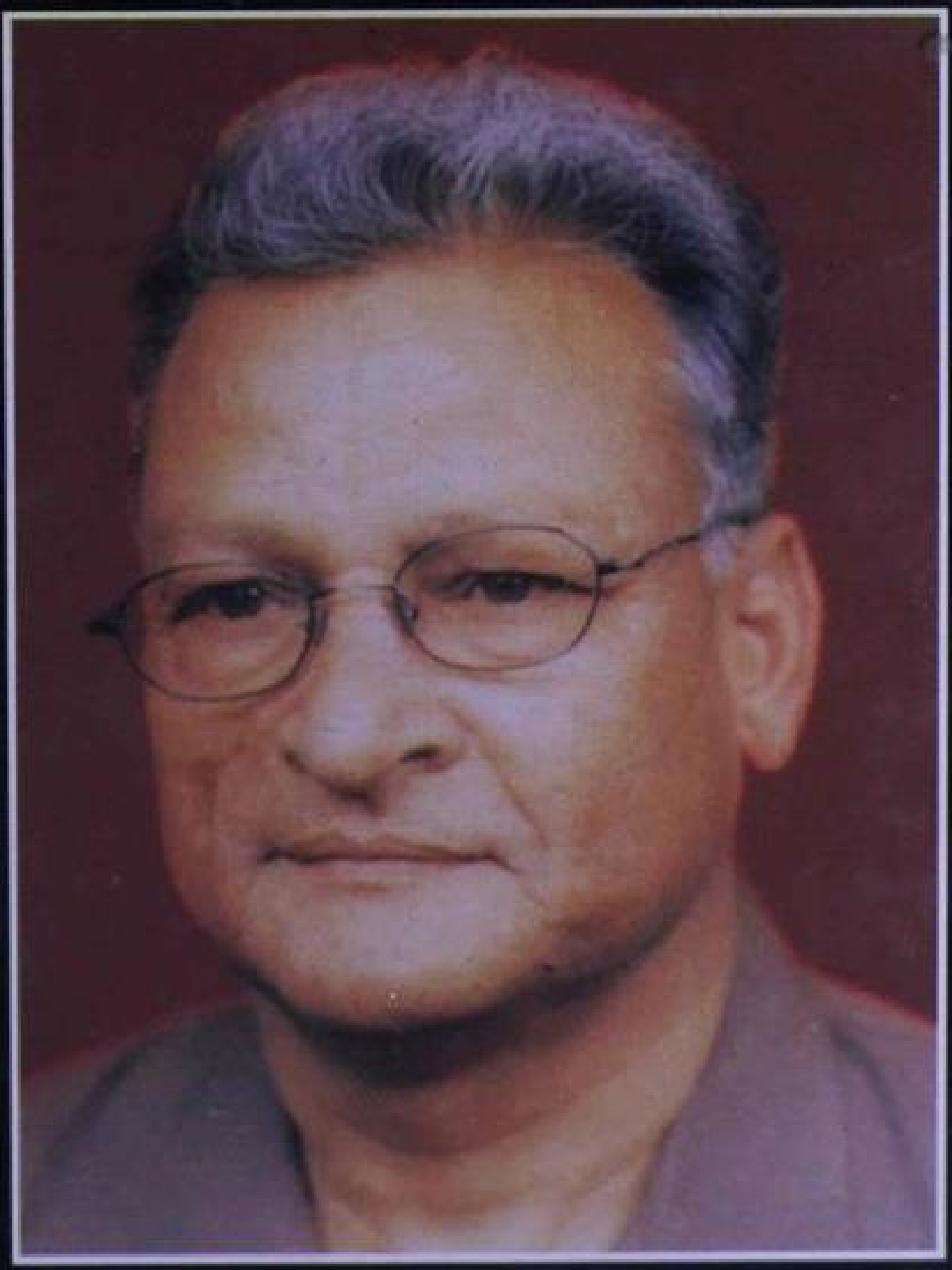
تم اپنے گرد حصاروں کا سلسلہ رکھنا
مگر ہمارے لیے کوئی راستہ رکھنا

ہزار سانحے پردیس میں گزرتے ہیں
جو ہو سکے تو ذرا ہم سے رابطہ رکھنا

خزاں رکھے گی درختوں کو بے ثمر کب تک
گزر ہی جائے گی یہ رت بھی حوصلہ رکھنا

تمہارے ساتھ سدا رہ سکیں ضروری نہیں
اکیلے پن میں کوئی دوست دوسرا رکھنا

زیادہ دیر ظفرؔ ظلم رہ نہیں سکتا
اگر اب آئیں کڑے دن تو جی کڑا رکھنا



صورتِ مرگ فقط راہ کی ٹھوکر نکلی
زندگی تُو مرے اندازے سے کم تر نکلی

آتشِ کبر نکلتی ہی نہ تھی دل سے ظفرؔ
چوبِ منبر کو جلایا تو یہ کافر نکلی